مآثرِ غالب

(غالب کی کم یاب نظم و نثر کا مجموعہ)

مرتبہ

قاضی عبدالودود

تصحیح و ترتیبِ جدید

ڈاکٹر حنیف نقوی

ادارۂ یادگارِ غالب کراچی

مآثرِ غالب

(غالب کی کم یاب نظم و نثر کا مجموعہ)

مرتبہ

قاضی عبدالودود

تصحیح و ترتیبِ جدید:

ڈاکٹر حنیف نقوی

اردو ترجمہ خطوطِ فارسی:

پرتو روہیلہ

ادارۂ یادگارِ غالب

کراچی

سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ یادگارِ غالب، شمارہ نمبر: ۲۴

*

طبعِ اول:	۱۹۳۹ء	پٹنہ
طبعِ دوم:	۱۹۹۵ء	پٹنہ
موجودہ طبعِ سوم:	۲۰۰۰ء	کراچی

*

طابع: احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی
تعداد: ایک ہزار
قیمت: ایک سو پچاس روپے

*

فنی تدوین: رفیق احمد نقش

*

ادارۂ یادگارِ غالب
پوسٹ بکس: ۲۲۶۸
ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

*

غالب لائبریری
دوسری چورنگی، ناظم آباد
کراچی ۷۴۶۰۰

مجلسِ ادارت برائے اشاعتِ کتب

بیگم مجید ملک	صدر نشیں، ادارۂ یادگارِ غالب
مختار زمن	معتمدِ عمومی، ادارۂ یادگارِ غالب
رعنا فاروقی	معتمد، ادارۂ یادگارِ غالب
سید اعجاز حسین	خازن، ادارۂ یادگارِ غالب
ڈاکٹر مشرف احمد	شریکِ معتمد، ادارۂ یادگارِ غالب

فہرست

حصّۂ اوّل

(متفرقاتِ نثر و نظمِ اردو و فارسی)

از مرزا اسداللہ خاں غالب

* * *

اردو نظم ۳۵ تا ۳۹

فارسی نثر ۴۰ تا ۴۲

فارسی نظم ۴۳ تا ۴۶

* * *

حصّۂ دوم

خطوطِ فارسی

* * *

* * *

***

***

ترجمہ

***

***

ابتدائیہ

زیرِ نظر کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں "علی گڑھ میگزین" کے غالب نمبر (مدیر: ڈاکٹر مختار الدین احمد) میں بطورِ ضمیمہ شامل کی گئی تھی اور اسے ۱۹۴۹ء ہی میں محدود تعداد میں انجمنِ ترقیِ اردو، بہار، کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔

قاضی عبدالودود کے، غالب سے متعلق، کاموں میں اس کتاب کو گلِ سر سبد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں نہ صرف غالب کی نادر تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے، بلکہ ان پر قاضی صاحب کے عالمانہ حواشی نادر معلومات کا خزینہ ہیں، تاہم خود قاضی صاحب اپنے اس کام سے مطمئن نہ تھے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے بعض امور کی حسبِ دل خواہ تحقیق نہیں ہو سکی۔

چند برس پہلے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے قاضی عبدالودود کے کاموں کی از سرِ نو اشاعت کا منصوبہ شروع کیا تو انھیں "مآثرِ غالب" کی ترتیبِ نو کا بھی خیال آیا۔ ڈاکٹر بیدار کی نظرِ انتخاب کی داد دینی چاہیے، انھوں نے یہ کام ڈاکٹر حنیف نقوی کے سپرد کیا کہ ان کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا محقق اس بارِ گراں کو اٹھانے کی ہمت کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی ان اہلِ علم میں سے ہیں جو ایک عرصے سے نہایت خاموشی کے ساتھ تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں، خصوصاً غالب پر جیسا اور جتنا معیاری کام انھوں نے کیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ "مآثرِ غالب" کی ترتیبِ نو کا کام انھوں نے جس خوش اسلوبی سے انجام دیا، اس کی داد ڈاکٹر گیان چند نے ان الفاظ میں دی ہے:

ڈاکٹر حنیف نقوی نے... اس تفصیل سے حواشی لکھے ہیں کہ اضافے

تو اضافے، تصحیحات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ وہ واحد آدمی ہیں جس نے قاضی صاحب کی تحریر میں اتنی زیادہ تصحیحات و توضیحات کی ہیں... میں اس کتاب کے ایک صفحے کے بھی حواشی لکھنے کا اہل نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ حنیف نقوی کو غالب سے متعلق افراد، غالب کی فارسی تحریروں اور فارسی ادبیات کا اتنا گہرا عرفان ہے۔ وہ... چوٹی کے محققِ غالبیات ہیں۔ ("رموزِ غالب"، ص ۴۲۶ و ص ۴۳۷)

واضح رہے کہ ڈاکٹر حنیف نقوی ڈاکٹر گیان چند کے شاگرد ہیں۔ ایک استاد کا اپنے شاگرد کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنا جہاں شاگرد کی علمیت کا اعتراف ہے، وہیں ان سے استاد کی وسیع القلبی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

"مآثرِ غالب" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں ادارہ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ، کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، اس ایڈیشن کی طرف سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے اس پر مزید کام کیا اور نادر معلومات کا اضافہ کر کے اس کتاب کو اشاعتِ ثالث کے لیے تیار کیا اور ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، کو اشاعت کے لیے عنایت فرمایا۔ ادارہ اس اہم کتاب کو ڈاکٹر صاحب کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہا ہے۔

یہ اشاعت ترتیب کے اعتبار سے بھی طبعِ دوم سے قدرے مختلف ہے، البتہ اس میں نوادر کے جو عکس شائع کیے جا رہے ہیں، وہ طبعِ دوم کے مطابق ہیں۔

اس اشاعت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فارسی خطوط کے اردو تراجم بھی شامل ہیں جو معروف شاعر پرتو روہیلہ نے کیے ہیں۔ جناب پرتو اس سے پہلے "نامہ ہاے فارسیِ غالب" کا نہایت عمدہ ترجمہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے خطوط پر مختصر، مگر مفید، حواشی لکھے ہیں اور فرہنگ بھی تیار کی ہے۔ حواشی میں "مآثرِ غالب" طبعِ دوم کے حوالے ہیں جنھیں موجودہ طباعت میں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

پیش گفتار

"تاثرِ غالب" مرزا غالب کی متفرق اردو فارسی تحریروں کا مجموعہ ہے جسے قاضی عبدالودود نے مرتب کر کے ۱۹۴۹ء میں شائع کیا تھا۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصۂ اول میں مندرجۂ ذیل تحریریں شامل ہیں:

(الف) اردو نثر:

(۱) دیباچہ "لطائفِ غیبی"
(۲) دیباچہ "تیغِ تیز"
(۳) ایک استفتا
(۴) مکتوب بنام سید ولایت علی
(۵) دو فارسی شعروں کے مطالب۔

(ب) اردو نظم:

(۱) اشتہارِ "پنج آہنگ"
(۲) غزلِ اردو
(۳) رباعی در ہجو سعادت علی
(۴) فردیات

(ج) فارسی نثر:

(۱) تقریظِ "قاطع برہان"
(۲) تقریظِ "سفرنگِ دساتیر"
(۳) تقریظِ "دری کشا"

(د) فارسی نظم:

(۱) نامۂ منظوم بنام جوہر

(۲) تیغ تیز

(۳) رباعی

(۴) فردیات

حصۂ دوم صرف خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ کل بتیس خط ہیں، جن میں سے چوبیس مرزا احمد بیگ تپاں کے نام ہیں، باقی آٹھ خطوں میں سے تین خواجہ محمد حسن کے نام، دو خواجہ فیض الدین حیدر شائق جہاں گیر نگری کے نام اور ایک ایک نواب علی اکبر خاں، مولوی سراج الدین احمد اور خواجہ فخرالله کے نام ہے۔

حصۂ اول کی اردو فارسی تحریروں میں سے (۱) "دو فارسی شعروں کے مطالب" (۲) "نامۂ منظوم بنام جوہر" اور (۳) "تیغ تیز" کے علاوہ باقی تمام تحریریں اس مجموعے کی اشاعت سے قبل بھی کسی نہ کسی جگہ مطبوعہ صورت میں دست یاب تھیں۔ علاوہ بریں "قاطع برہان"، "سفرنگ دساتیر" اور "دری گشا" کی تقریظوں، نامۂ منظوم بنام جوہر اور فارسی کی ایک رباعی کو خود غالب اپنی فارسی نگارشات کے آخری مجموعے "باغ دو در" (مرتبہ: ۱۲۸۳ھ/ ۶۷-۱۸۶۶ء) میں شامل کر چکے تھے، لیکن یہ مجموعہ ۱۹۶۰ء تک عدم اشاعت کی بنا پر اہل علم کی دست رس سے باہر تھا، اس لیے جہاں تک اس پہلے حصے کا تعلق ہے، قاضی صاحب کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے ان منتشر تحریروں کو ایک سلسلے میں منسلک کر کے غالب اور غالبیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے سہل الحصول بنا دیا ہے، البتہ کتاب کے آخر میں انھوں نے ان تحریروں پر جو مبسوط اور معلومات افزا حواشی لکھے ہیں، ان کی بدولت ان سے استفادے کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔

اس مجموعے کا اہم ترین سرمایہ وہ فارسی خطوط ہیں جن سے اس کا حصۂ دوم ترتیب دیا گیا ہے۔ ان میں سے صرف چار خط متن کے بعض اختلافات کے ساتھ "متفرقات غالب" مرتبۂ پروفیسر مسعود حسن رضوی میں بھی شامل ہیں۔ باقی اٹھائیس خطوط نہ تو اس سے پہلے کسی جگہ دست یاب تھے اور نہ اس کے بعد کسی دوسرے ذریعے سے سامنے آسکے ہیں، اس لیے

ان خطوط کی وجہ سے اس مجموعے کی جو اہمیت اس کی اشاعت کے وقت تھی، وہ تقریباً نصف صدی کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود اب بھی بدستور قائم ہے۔ یہ خطوط قاضی صاحب کو ڈھاکے کے مشہور طبیب اور مصنف شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان خاں مرحوم کے کتب خانے کی ایک بیاض سے حاصل ہوئے تھے۔ شیخ محمد اکرام کے نام قاضی صاحب کے ۲۵ اگست ۱۹۴۳ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط تقریباً اسی زمانے میں دست یاب ہوئے تھے۔ اس خط میں شیخ صاحبِ موصوف کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ:

> فارسی کے ۳۳ غیر مطبوعہ خطوط ابھی حال میں ملے ہیں، میرے ایک دوست انھیں مرتب کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ میں چھپوا دوں گا۔

("غالب نامہ"، شمارہ: جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۳)

اس کے کچھ دنوں کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۴۳ء کو شیخ صاحب ہی کے نام کے ایک خط میں ان خطوط کے بارے میں یہ اطلاعات فراہم کی گئی تھیں:

> غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط ڈھاکے میں ہیں اور مجھے ان کے دیکھنے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا۔ مکتوب الیہ احمد بیگ خاں تپاں اور مرزا ابو القاسم ہیں... یہ خطوط یا زمانۂ قیامِ کلکتہ میں لکھے گئے یا کلکتے سے واپسی کے کچھ بعد... ترتیب کا کام جاری ہے۔

(ایضاً، ص ۲۳۴)

ترتیب کے مبینہ کام کے سلسلے میں پروفیسر مختار الدین احمد کا بیان ہے:

> قاضی صاحب چاہتے تھے کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی، استادِ شعبۂ فارسی ڈھاکا یونی ورسٹی یہ خطوط مرتب کر دیں، لیکن وعدے کے باوجود وہ یہ کام نہ کر سکے۔ بالآخر قاضی صاحب نے ... میری فرمائش اور اصرار پر "علی گڑھ میگزین" کے "غالب نمبر" کے لیے انھیں مرتب کیا اور میں نے ۱۹۴۹ء میں اس کے ضمیمے کے طور پر شائع کر دیا۔

(ایضاً، حاشیہ، ص ۲۳۳)

خطوطِ فارسی کی دریافت و اشاعت کی اس مختصر روداد سے بہ خوبی ظاہر ہے کہ "مآثرِ غالب" کی ترتیب وطباعت کا اصل محرک انھی خطوط کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت کا احساس تھا۔ یہ مجموعہ، جیسا کہ پروفیسر مختار الدین صاحب نے تحریر فرمایا ہے، "علی گڑھ میگزین" کے ۱۹۴۸-۴۹ء کے شمارے کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس کا نام "آثارِ غالب" تجویز کیا گیا تھا۔ مختار الدین صاحب کے بقول:

> طباعت کے دوران شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی کتاب "آثارِ غالب" مجھے بھیجی۔ میں نے قاضی صاحب کو لکھا کہ اب یہ نام رکھنا مناسب نہیں، چناں چہ نام بدل کر "مآثرِ غالب" رکھا گیا۔ سرورق پر تو "آثار غالب" ہی چھپا ہے۔ لیکن سو دو سو جو آف پرنٹس نکلوائے گئے تھے، ان کے سرورق پر "مآثرِ غالب" کا نام چھپوایا گیا۔

(ایضاً، حاشیہ، ص ۳۳۱)

اس سلسلے میں خود قاضی صاحب نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے:

> یہ کتاب بنام "آثار غالب" "علی گڑھ میگزین" کے غالب نمبر سنہ ۱۹ء (کذا) میں شامل تھی۔ بعد کو اس کا علم ہوا کہ اس نام کی ایک اور کتاب موجود ہے تو وہ نسخے جو الگ سے چھپے تھے، "مآثرِ غالب" کے نام سے شائع ہوئے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ "مآثر" میں ایک سرورق زیادہ ہے اور [آخر میں] کچھ ضروری مطالب، بہ عنوانِ "التماس"، کا اضافہ ہے۔

("خدا بخش لائبریری جرنل"، شمارہ نمبر: ۷۵ تا ۷۷، ص ۳۶۱)

بدلے ہوئے نام کے علاوہ پیشانی پر نظیری کے شعر کے بجائے "سلسلۂ مطبوعاتِ انجمنِ ترقیِ اردو، صوبۂ بہار" کا اندراج اور کتاب کے نام کے نیچے "(غالب کی کم یاب نظم و نثر کا مجموعہ)" نیز صفحے کے نچلے حصے میں بائیں جانب "طبعِ اول ستمبر ۱۹۴۹ء" کے اضافے بھی اس نئے سرورق کو پچھلے سرورق سے ممیز کرتے ہیں۔ یہ بات کہ بہ وجوہ کتاب کا نام بدل کر "مآثرِ غالب" کر دیا ہے، "التماس" کے تحت درج ہے۔

جیسا کہ قاضی صاحب شیخ محمد اکرام کے نام اپنے دوسرے خط میں واضح فرما چکے ہیں، "نامۂ غالب" کے ان فارسی خطوط میں سے بیش تر غالب کے قیامِ کلکتہ کے زمانے کی یادگار ہیں۔ کلکتے کا یہ سفر غالب کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں شامل ہے، اس لیے یہ خطوط تاریخی حیثیت سے غیرِ معمولی اہمیت کے حامل ہیں، لیکن اشاعت کے بعد، تقریباً آدھی صدی گزر جانے کے باوجود ان سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ مثنوی "بادِ مخالف"، جو "آشتی نامہ" کے نام سے اسی زمانے میں لکھی گئی تھی، غالب کے ناقدین و محققین کی تحریروں میں بار بار موضوعِ بحث بن چکی ہے، لیکن یہ مثنوی جس معارضے کی دین ہے، اس کے بارے میں ہماری معلومات ہنوز ناقص اور نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔ اس مجموعے کے مکتوب نمبر: ۲۶/۳۰ کو دوسرے مجموعوں کے بعض خطوں کے ساتھ ملا کر پڑھنے اور بہ نظرِ غائر ان کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واشگاف طور پر سامنے آجاتی ہے کہ کلکتے کی جس محفلِ مشاعرہ میں غالب کو ہدفِ اعتراض بنایا گیا تھا، اس کا پہلے سے کوئی وجود نہ تھا، بلکہ اس کی بنیاد بطورِ خاص ان کی "تذلیل و تخریب" کے لیے رکھی گئی تھی۔ اگرچہ اس سارے ہنگامے کے پیچھے خواجہ حاجی کے سالے مرزا افضل بیگ کا ذہن کارفرما تھا لیکن اس انجمن کے اصل بانی مولوی سراج الدین احمد تھے، جو بعد میں غالب کے احبابِ خاص میں شامل ہو کر ان کے "مخلصِ صادق الولا" کے درجے تک پہنچے۔ اس قاصمانہ شورش سے نجات حاصل کرنے کے لیے مثنوی "آشتی نامہ" کی صورت میں "راہِ پوزش و اعتذار" اختیار کرنے کے باوجود غالب کے اصل مخالفین و معاندین ان کی خطا معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، البتہ یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد مولوی سراج الدین احمد کے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چلا تھا اور انھوں نے باہمی تعلقات کی استواری کے لیے سلسلہ جنبانی بھی شروع کر دی تھی۔

ان خطوط سے مدرسۂ سرکارِ کمپنی میں ہر شمسی مہینے کے پہلے اتوار کو منعقد ہونے والے مذکورۂ بالا مشاعرے سے متعلق بعض اہم باتوں کے علاوہ ایک "بزمِ طرب" کے انعقاد کا بھی علم ہوتا ہے، جس میں غالب بڑی پابندی اور ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ اس بزم کے لیے چہار شنبے کا دن مقرر تھا اور بہ ظاہر یہ رقص و سرود کی محفل ہوتی تھی،

نیں اس کے لیے کوئی ایک جگہ مخصوص نہ تھی اور حتمی طور پر مہینے کے کسی خاص ہفتے کا تعین بھی نہ تھا (خطوط نمبر: ۵۰، ۱۱۱، ۱۲۱ و ۱۳۱)۔

یہ خطوط غالب کے بعض ایسے معمولات سے بھی واقفیت بہم پہنچاتے ہیں جن کے بارے میں دوسرے ذرائع سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً خط نمبر: ۱۷۱ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے ہی سے رات کے کھانے کے معاملے میں کافی محتاط تھے، یا خاصے تکلف و تأمل سے کام لیتے تھے، اور اتوار کے دن گوشت مطلقاً نہ کھاتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا اپنا بیان یہ ہے:

بندہ را در طعام امروزہ دو عذر صریح است۔ یکے ایں کہ بہ شب مبادرت بہ اکلِ غذا نہ می کنم ہر گز۔ دوم امروز روزِ یکشنبہ است، از اکلِ لحم اجتناب دارم۔ (ص ۲۰)

حقہ کشی سے غالب کے شغف کے بارے میں مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

حقہ بھی پیتے تھے اور اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ صبح، دوپہر، شام، جب جی چاہا تازہ کروا لیا۔ کام کر رہے ہیں اور حقے کا کش لگ رہا ہے۔ تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ حقے کی ظاہری شکل و صورت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ("ذکرِ غالب"، مطبوعہ ۱۹۶۴ء، ص ۲۲۴)

خطوط نمبر: ۵/۲۱ و ۶/۲۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے کے سفر کے دوران ان کے حقوں کے نیچے خراب ہو گئے تھے۔ چناں چہ انھیں ان کی درستی کی فکر لاحق تھی اور کسی ایسے نیچہ بند کی تلاش تھی جو ان کی مرضی کے مطابق ان کی مرمت کر سکے۔ اس سلسلے میں مرزا احمد بیگ تپاں کی خدمت میں عرض پرداز ہیں:

نیچہ ہا از ہم فرو ریختہ۔۔۔ جانورا بفرمائید تا تصدیعہ کشیدہ نزدِ من بیاید تا نیچہ ہا بہ وے بسپارم و بہ طریقے کہ درستی منظور دارم، بہ وے بفہمانم، تا کار رواں گردد۔ (ص ۱۶)

خط نمبر: ۲۱۹ سے کمتب نشینی اور عقیقے کی تقاریب کے سلسلے میں اہلِ دہلی کے بعض معمولات اور رسوم کا علم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> در شہرِ خویش چنیں نہ دیدہ ام کہ در شادیِ بسم اللہ در محافل و مجالس بہ دستِ طفل چیزے دہند- آرے، بہ تقریبِ ختنہ ایں چنیں بہ عمل می آید، لیکن در شادیِ مکتب نشینی دو رسم در دیارِ خویشتن دیدہ ام، یکے آں کہ ملاے کہ طفل را سورۂ اقرا باسم ربک بہ خواندن می دہد، اعمام و اخوانِ طفل چیزے بہ ملا می دہند فقط- دوم ایں کہ خوان ہاے میوہ، یا نقد، بہ طریقِ شگونِ تہنیت می فرستند- فقط- (ص ۱۲)

سوانحی، تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے ان خطوط کی اہمیت کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جن پر یہاں بالتفصیل گفت گو کی گنجائش نہیں- فی الجملہ ان کی افادیت کے سلسلے میں یہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ اس شخص کے قلم کی تحریریں ہیں جس کا لفظ لفظ عزت و اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے- چوں کہ "علی گڑھ میگزین" کا "غالب نمبر" اور "تاثرِ غالب" دونوں ہی کے نسخے اب تقریباً نایاب ہو چکے ہیں، اس لیے ان خطوط کو اور اس وسیلے سے اس مجموعے کی دوسری تمام نگارشات کو غالبیات سے شغف رکھنے والوں کے لیے سہل الحصول بنانے کی غرض سے جدید اصولِ ترتیب و تدوین کے مطابق دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے-

یہ خطوط حکیم حبیب الرحمان صاحب مرحوم کے کتب خانے کی جس بیاض سے منقول ہیں وہ اشاعت کے لیے ان کی ترتیب کے وقت قاضی صاحب کے سامنے موجود نہیں تھی، لیکن اس سے قبل ان کی نظر سے گزر چکی تھی اور اس کی نقل انھوں نے خود تیار کی تھی- اپنی یادداشت میں انھوں نے اس بیاض کی کیفیت ان الفاظ میں قلم بند کی ہے:

> حکیم حبیب الرحمان جہاں گیر نگری کے پاس ایک مجموعہ تھا جس کی نقل میں نے خود کر لی تھی- "تاثرِ غالب" کے ۳۲ خطوطِ فارسی اسی مجموعے میں ہیں- اس میں علی اکبر خاں کے نام کا ایک خط جو "پنج آہنگ" ص ۴۵ (کلیاتِ نثر، ط ۱) میں ہے، خاتمۂ "گلِ رعنا" (ناتمام) اور "بادِ مخالف" کی اولین روایت بھی موجود ہیں- "تاثر" میں متنِ خطوط نقل پر مبنی ہے- وقتِ ترتیب مجموعے سے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں- مجموعے میں نامِ کاتب اور زمانۂ کتابت (کذا-

کتابت) درج نہیں۔ کاتب ظاہرا ذی علم نہیں۔ "ملاذی" کو "ملاذہی"، "پرسش" کو "پرشش"، "بالجملہ" کو "بالجملہ" (۳ جگہ)، "باسم" کو "بسم"، "سع" کو "معہ" لکھتا ہے۔ ذالِ فارسی کے معاملے میں کبھی غالب کا پیرو ہے، کبھی ان سے منحرف۔ "بڑھ" کو "بعڑ" لکھنا غالباً تقلیدِ غالب ہے۔ حکیم صاحب نے اپنے ایک خط میں اسے "شائق جہاں گیر نگری کا مجموعہ" سمجھا تھا، اس کا مطلب ظاہرا تو یہ ہے کہ وہی اس کے مرتب تھے۔

("خدا بخش لائبریری جرنل"، پٹنہ، شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص ۳۶۱)

تدوینِ متن کے معاملے میں قاضی صاحب کا معیار خاصا بلند تھا، لیکن جب یہ مجموعہ طبع ہو کر سامنے آیا تو اس کا متن اردو کتابت و طباعت کی عام روایات کے مطابق اغلاط سے پاک نہ تھا۔ علاوہ بریں چوں کہ اس کی "ترتیب بڑی عجلت میں ہوئی" تھی، اس لیے "بعض امور کی حسبِ دل خواہ تحقیق (بھی) نہ ہو سکی" تھی۔ مجموعے کی اس کیفیت کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام ۱۸ اگست ۱۹۳۹ء کے خط میں قاضی صاحب نے ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے:

"آثارِ غالب" [مآثرِ غالب] کے کچھ اجزا بہت غلط اور خراب چھپے ہیں، اس کی صحت میں [بدیں وجہ] کہ غلط نامہ میری نگرانی میں نہیں چھپ سکتا، میں نے فضول دردِ سر مول نہ لیا اور کتاب غلط نامے کے بغیر شائع ہو گئی۔ اگر طبعِ ثانی کی نوبت آئی تو اپنی نگرانی میں چھپواؤں گا۔ ("غالب نامہ"، شمارۂ جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۱ و ۲۲۲)

"مآثرِ غالب" کا انتساب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں قاضی صاحب نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ان کے نام کے ایک خط میں بہ طورِ معذرت انھی تاثرات کا اعادہ فرماتے ہوئے لکھا تھا:

مآثرِ غالب ایک بہت ہی حقیر تحفہ ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح اس کا احساس ہے کہ اس کی ترتیب و تصحیح

کما حقہٗ نہ ہوسکی، اور اس کا آخری حصہ تو ایسا برا چھپا ہے کہ دیکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ ("غالب نامہ"، شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص ۲۲۳)

ان حالات میں ضروری تھا کہ تصحیحِ متن کے لیے اصل مآخذ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس سلسلے میں حکیم حبیب الرحمان صاحب مرحوم کے کتب خانے کی مذکورۂ صدر بیاض کی بھی تلاش کی کوشش کی گئی، لیکن کافی جدوجہد کے باوجود اس کے حصول میں کامیابی نہ ہو سکی۔ حکیم صاحب کا کتب خانہ ان کی وفات (۲۳ فروری ۱۹۴۷ء) کے بعد ڈھاکا یونی ورسٹی لائبریری میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس لائبریری کے فارسی و عربی و اردو مخطوطات کی فہرست (انگریزی) مرتبۂ پروفیسر اے بی ایم حبیب اللہ (مطبوعہ ۱۹۶۶ء و ۱۹۶۸ء) میں اس کتب خانے کے خطی نسخوں کی تفصیلات خاصی تعداد میں اور کافی شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں، لیکن ان میں کسی ایسی بیاض، یا مخطوطے، کا ذکر نہیں ملتا جس میں غالب کے خطوط اور دوسری متذکرہ تحریریں موجود ہوں۔ اس فہرست کے علاوہ بعض باخبر حضرات سے رجوع کے نتیجے میں بھی اس بیاض کے متعلق کوئی باوثوق اطلاع نہ مل سکی۔ پروفیسر کلیم سہسرامی، صدرِ شعبۂ فارسی و اردو، راج شاہی یونی ورسٹی، راج شاہی (بنگلہ دیش)، نے اس سلسلے میں میرے ایک استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا:

> حکیم حبیب الرحمان مرحوم کا کتاب خانہ (مخزونہٗ ڈھاکا یونی ورسٹی لائبریری) اور "ثلاثۂ غسالہ" میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ غالب کے فارسی خطوط کی بیاض اس میں نہیں... ڈاکٹر شادانی کے توسط سے یہ بیاض قاضی صاحب کو ملی تھی اور مثنوی "بادِ مخالف" کا پہلا ایڈیشن بھی انھیں یہیں سے ملا تھا۔ عجب کیا، فارسی بیاض وہی لے گئے ہوں۔

(مکتوب، مؤرخہ ۲۳ اگست ۱۹۹۳ء)

کلیم صاحب کا یہ قیاس بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا کتب خانہ ان کی وفات (۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء) کے بعد کہاں اور کس حال میں ہے؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ یہ کتب خانہ جہاں بھی ہوگا، اس بیاض کو بھی وہیں ہونا چاہیے۔ بہر صورت موجودہ حالات میں یہ مرتب کی دست رس سے باہر ہے۔ قاضی صاحب کی تیار کردہ نقل بھی بعض

وجوہ سے دست یاب نہ ہو سکی، اس لیے بہ حالتِ مجبوری ان خطوط کے متن کی تصحیح کے لیے بعض اوقات ثانوی ذرائع اور بعض مقامات پر صرف قیاس سے کام لینا پڑا ہے، البتہ حصۂ اوّل کی تحریروں کا مقابلہ پوری احتیاط کے ساتھ ان کے اصل مآخذ اور دوسرے دست یاب مصادر سے کرلیا گیا ہے۔

★

(۱) کتاب میں اس کے سرورق سے آخر تک جہاں جہاں اس کا اوّلین نام "آثارِ غالب" آیا تھا، اسے بدل کر "مآثرِ غالب" بنادیا گیا ہے۔

(۲) حصۂ اوّل میں "کھوں یا نہ کھوں" ردیف والی غزل میں ایک شعر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ شعر قاضی صاحب کے یہاں ("معیار"، ۱۹۳۶ء) میں موجود تھا اور غالباً کسی سہو کی بنا پر طبعِ اوّل میں جگہ نہ پا سکا تھا، اس کے برخلاف "نامۂ منظوم بنامِ جوہر" کے دو زائد اشعار کو اصل متن کی بجائے ذیلی حاشیے میں جگہ دی گئی ہے، کیوں کہ عینِ ممکن ہے کہ یہ اشعار بعد میں اضافہ کیے گئے ہوں۔

(۳) حصۂ دوم کے تحت فارسی خطوط، بیاض کی اصل ترتیب کے مطابق، منقول تھے۔ ہم نے اوّلاً انھیں ان کے مکتوب الیہم کی مناسبت سے علاحدہ علاحدہ حصوں میں تقسیم کیا ہے، بعد ازاں ہر مکتوب الیہ کے نام کے خطوں کو بہ اعتبارِ زمانہ ایک سلسلے میں مرتب کر دیا ہے۔ موجودہ ترتیب اور طبعِ اوّل میں کسی خط کے مقام کے اس فرق کی وضاحت کے لیے ہر خط کی پیشانی پر دُہرے نمبروں کی صورت میں اوپر موجودہ سلسلے وار ترتیب اور نیچے سابقہ ترتیب کی نشان دہی کردی گئی ہے۔

(۴) طبعِ اوّل پر اضافے کے طور پر مکتوب نمبر: ۱۸/۲ کے نامعلوم الاسم مکتوب الیہ کی نشان دہی کے علاوہ دو خطوں (نمبر: ۲۵/۸ و ۲۶/۳۰) کے جن نئے مکتوب الیہوں کا پتا لگایا گیا ہے، ان سے متعلق ضروری شواہد حواشیِ خطوط کی فصلِ سوم کے ذیلی حاشیوں میں پیش کر

دیے گئے ہیں۔

(۵) ہر خط کے آخر میں قوسین کے اندر اس کے زمانۂ تحریر کی نشان دہی کا التزام کیا گیا ہے۔ تاریخوں کے تعین میں جن دلائل و شواہد سے کام لیا گیا ہے، ان کی تفصیلات بھی ان خطوط سے متعلق حواشی کی فصلِ سوم کے ذیلی حاشیوں میں درج ہیں۔

(۶) خطوط کے آخر میں تاریخوں کے اندراج کے معاملے میں ہجری و عیسوی تاریخوں کے درمیان کسی پہلے سے طے شدہ ضابطے کی پابندی نہیں گئی ہے، بلکہ جس ہجری یا عیسوی تاریخ یا مہینے کی بنیاد پر کسی خط کے زمانۂ تحریر کا تعین کیا گیا ہے، اسے پہلے اور اس کے مطابق دوسری تاریخ کو اس کے بعد رکھا گیا ہے۔

(۷) ہجری اور عیسوی تاریخوں کے درمیان تطابق کے کام میں تقویم کی بجائے غالب کی تحریروں سے مدد لی گئی ہے، جو یقیناً دوسرے تمام ذرائعِ معلومات سے زیادہ مستند و معتبر ہیں۔

(۸) اگر طبعِ اوّل میں کوئی لفظ غلط ہے اور اصل ماخذ کی مدد سے اس کی تصحیح ممکن ہے تو متن میں صحیح لفظ لکھ کر حاشیے میں اس غلطی کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

(۹) اگر کوئی لفظ طبعِ اوّل اور اس کے ماخذ، دونوں ہی میں موجود، لیکن صریحاً غلط اور منشاے مصنف کے خلاف ہے اور قیاساً اس کی تصحیح کی جا سکتی ہے تو متن میں اس کی جگہ صحیح لفظ لکھ کر حاشیے میں اس کا اظہار کر دیا گیا ہے۔

(۱۰) اگر طبعِ اوّل میں کوئی لفظ اصل ماخذ کی بہ نسبت کم ہے اور یہ کمی نفسِ مطلب کو متاثر کر رہی ہے تو متن میں اس کا اضافہ کر کے حاشیے میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔

(۱۱) اگر طبعِ اوّل میں کوئی لفظ اصل ماخذ کی بہ نسبت زائد اور غیر ضروری ہے تو اسے متن سے خارج کر کے حاشیے میں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

(۱۲) اصل ماخذ کی عدم موجودگی کی صورت میں اگر تکمیلِ مطلب کی غرض سے دست یاب متن میں بربنائے قیاس کسی لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے تو اس زائد لفظ کو قلابین کے اندر جگہ دی گئی ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی، اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ "آثارِ غالب" کی یہ ترتیبِ جدید، جو پہلی بار ۱۹۹۵ء میں ادارہ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ، کی جانب سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی، اصلاً محبِ مکرّم ڈاکٹر عابد رضا بیدار، سابق ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، کی تحریک اور توجہ کی رہینِ منت ہے۔ ان کے اصرار اور توجہ کے بغیر، ممکن ہے کہ، یہ کام سرانجام ہی نہ پاتا۔ مذکورہ لائبریری کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر سلیم الدین احمد، محترمی جناب رشید حسن خاں، عزیزِ گرامی ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی اور مدرسۂ عالیہ رام پور کے سابق استاد محبی ڈاکٹر امتیاز احمد ندوی بھی کچھ کم شکریے کے مستحق نہیں کہ ان حضرات نے بھی وقتاً فوقتاً بہت سی مشکلات کے حل میں مدد فرمائی۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، کی طرف سے اس تازہ اشاعت کا سہرا پوری طرح ادارے کی مجلسِ ادارت کے سر ہے جن کی فرمائش کے نتیجے میں اتنی جلد اس مجموعے کے مندرجات و معروضات کا ازسرِ نو جائزہ لینے اور ان پر نظرِ ثانی کرنے کی صورت پیدا ہوئی۔ مرتب اس کے لیے صمیمِ قلب سے اراکینِ ادارہ کا ممنون و متشکر ہے۔

بنارس   حنیف نقوی

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۷ء

یہ کتاب

جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

کے نام معنون کی جاتی ہے

عرضِ حال

مآثرِ غالب کا بہت بڑا حصہ یا تو قلمی کتابوں سے لیا گیا ہے، یا ایسے مطبوعات سے جو عام دست رس سے باہر ہیں۔ اس سے جو چیزیں مستثنیٰ ہیں، ان کے شمول کی وجہ اپنی اپنی جگہ پر بیان کی جائے گی۔

فارسی خطوط حکیم حبیب الرحمان مرحوم کے کتب خانے کے ایک قلمی مجموعے سے ماخوذ ہیں۔ حکیم صاحب اردو کے اچھے انشا پرداز اور زبردست حامی تھے۔ اس کا اندازہ ان کے کارنامۂ حیات "ثلاثۂ غسالہ" کی اشاعت سے ہوگا۔ ان کی بے وقت وفات سے اردو کا بڑا نقصان ہوا۔

مآثرِ غالب کی ترتیب یا اس کے حواشی کی تحریر میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی، جناب عرشی، جناب مہیش پرشاد، جناب سید وزیر الحسن عابدی اور جناب مختار الدین احمد آرزو سے مدد ملی ہے۔ میں ان اصحاب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ چھاپے کی نگرانی بھی آرزو صاحب کے سپرد ہے۔ اگر وہ اسے صحیح چھپوا سکے تو دُہرے شکریے کے مستحق ہوں گے۔

مآثرِ غالب کی ترتیب بڑی عجلت میں ہوئی ہے۔ بعض امور کی حسبِ دل خواہ تحقیق قلتِ وقت کی وجہ سے نہ ہو سکی۔ میں ناظرین سے معذرت خواہ ہوں۔

عبدالودود

حصۂ اوّل

(متفرقات نثر و نظمِ اُردو و فارسی)

(اُردو نثر)

[۱] دیباچۂ "لطائفِ غیبی"

سیاحِ بحر و بر، ہیچ مدانِ بے ہنر، سیف الحق، میاں داد خاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ میں رہنے والا اورنگ آباد، دکن کا ہوں۔ میں نے بعدِ تحصیلِ علمِ رسمیہ سیاحت اختیار کی(۱)۔ بنگالہ، دکن، پنجاب، وسطِ ہند، بلادو گوئی کے کہاں تک نام لوں، قلم روِ ہند میں سرتاسر پھرا ہوں، بلکہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ آیا ہوں۔

ان دنوں میں دو رسالے نثر کے میری نظر سے گزرے: ایک "قاطعِ برہان" اور ایک "محرق قاطعِ برہان"۔ "پہلا نسخہ یعنی "قاطعِ برہان" کا مؤلف ایک شخص ہے منتظم(۲) اور مکرم، والا رتبہ، عالی شان، عالی خاندان، انگریزی رئیس زادوں میں محسوب، بادشاہِ دہلی کے حضور سے خاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، یعنی غالب تخلص، اسد اللہ خاں بہادر، اور محرق کا جامع کوئی شخص ہے رعایائے دہلی میں سے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی محکمۂ انگریزی کا سررشتہ دار ہو گیا تھا اور اب خانہ نشیں ہے، موسوم بہ منشی سعادت علی، نہ(۳) نثر سے واقف، نہ نظم

سے آگاہ، نہ عقل کا سرمایہ، نہ علم کی دست گاہ، کسی بستی میں، کسی گانو(۴) میں کسی گھاٹ پر، کسی باٹ پر اس بزرگ کا نام کسی سے نہیں سُنا۔

اللہ، اللہ! غالبِ نام آور نام دار، کوئی شہر ایسا نہ دیکھا جس میں ان کے دو چار شاگرد، دس بیس معتقد نہ دیکھے ہوں۔ ایک عالم ان کی فارسی دانی اور شیوا بیانی کا معترف۔ نظم میں ملا(۵) ظہوری و نظیری و عرفی کے برابر، نثر میں نثارانِ سابق و حال سے بہتر۔ کلیاتِ نظم نسخۂ سِر ساحری، نثر میں "پنج آہنگ" سلکِ درِ خوش آب، "دستنبو" گوہرِ نایاب، "مہرِ نیمروز" غیرتِ آفتاب، ہر نکتہ ایک کتاب، ہر کتاب ممتنع الجواب۔ جو بلاغت اور فصاحت کو جانتے ہیں اور معنی کا حسن پہچانتے ہیں، متفق علیہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔ اگر ایک آدمی کو عوام میں سے یہ عقیدہ نہ ہو تو وہ آدمی بے شک ایک گروہ کا مردود ہوگا:

گر نہ بیند بہ روز شپرہ(۶) چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ (۷)

محرق کی عبارت، واہ کیا کہنا ہے، مبتدا کچھ، خبر کچھ، روابط نامربوط، ضمائر محذوف، اوّل سے آخر تک سوال دیگر، جواب دیگر کا التزام، عبارت یک قلم حشو اور حشو بھی قبیح، بااین ہمہ وہ رسالہ سراسر بغض و عناد و سوءِ ظن و حمق و خبط و سب و فحش کا مجموعہ ہے۔ آیا خاطرِ میمونِ منشی صاحب میں کیا آیا جو اس رسالے کی تحریر کا قصد فرمایا؟ کتاب خوگیر، عبارت خوگیر کی بھرتی۔ جو اشعار بہ چشم داشتِ سند لکھے ہیں، وہ(۸) زیر تنگ، زبر تنگ، سوار نابینا، مرکب کھنہ لنگ(۹) کتاب گدڑی، ہر فقرہ ٹکڑا، ہر ٹکڑے کا نیا رنگ۔ کیا منشی جی نے یہ قیاس کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی عالم، کوئی عاقل، کوئی منصف نہیں ہے؟ اللہ اللہ! ہندوستان مجمعِ فضل و کمال ہے، منشی جی کے حمق کا پردہ کھل جائے گا، بلکہ مولانا غالب کا ایک ایک شاگرد منشی جی کا خاکا اُڑائے گا۔ مجھ کو تو حمیت اور رعایتِ حق اس تحریر کی باعث ہوئی تاکہ میں نے بیس لطائف جمع کیے اور اس نگارش کا "لطائفِ غیبی" نام رکھا:

در پسِ آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت: "بگو" می گویم

[۲] دیباچۂ "تیغِ تیز"

اللہ جل شانہٗ اپنے بندوں کو ورزشِ امورِ خیر کی توفیق دے۔ اچھا ہے وہ بندہ جس کو ظلم کی خو نہ ہو اور ظلم کی انواع ہیں، ازاں جملہ، ایک سخن پروری ہے کہ اس کو بے ایمانی بھی (۱۰) کہنا چاہیے، یعنی کتمانِ حق اور اعلان باطل بہ اصرار۔ اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ میں نے خاص نظر بہ اعلانِ حق "برہانِ قاطع" کی عبارت کی سستی اور بیان کی غلطی اور اطنابِ ممل (۱۱) کی نکوہش میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام "قاطعِ برہان" اور "درفشِ کاویانی" رکھا۔ جب بعد انطباع وہ رسالہ مشتہر ہوا تو پہلے بہل اس مثلِ ہندی کے مطابق "بیل نہ کودا، کودی گون" ایک مردِ بے مغز، معوج الذہن، نہ فارسی داں، نہ عربی خواں نے میری نگارش کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی، "محرقِ قاطع" اس کا نام رکھا اور اس کو مشتہر کیا۔ میرے ایک یار نے اس کتاب کے جواب میں کچھ لطائف جمع کیے اور "لطائفِ غیبی" اس کا نام رکھا۔ وہ نسخہ بھی مشہور ہوا پھر ایک مرزا رحیم بیگ، میرٹھ کے رہنے والے بروے کار آئے اور ایک تحریر مسمیٰ بہ "ساطعِ برہان" نکال لائے۔ مطالبِ مندرجہ لغو، بیش تر "محرقِ قاطع" کے مضامین منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ (۱۲) بھیجا، زیادہ اس طرف التفات کو تضیعِ اوقات جانا۔

ثالثاً میاں امین الدین کہ اب پٹیالے میں ملقب بہ مدرس ہیں، انھوں نے ایک "قاطع القاطع" چھپوایا۔ استعدادِ علمی میں سے، بعد صرفِ مقاصدِ نحو و صرف، فارسیت کی اسی قدر رعایت منظور رکھی کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں۔ باقی سوائے عربیِ قشری اور فارسیِ مسروقہ کے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے، بھٹیارے استعمال کرتے رہتے ہیں، کمال یہ کہ ان کا منطق ہندی اور حضرت کی عبارت فارسی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی (۱۳) جُلاہے ان دنوں میں علم تحصیل کر کے مہذب ہو گئے ہیں۔ عمامہ باندھے ہوئے پڑے پھرتے ہیں۔ فحش نہیں بولتے۔ خلاف اپنی قوم کے "صاحب و قبلہ" ان کا روزمرہ ہے۔ یارب! میاں امین الدین کس بُری قوم اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے، مدرس بنے مگر الفاظِ مستعملۂ قوم نہ چھوڑے۔ اگر میری طرف سے ازالۂ حیثیت کی

نالش دائر ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی؟ مگر میرے کبرِ نفس نے ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر دلیل ہے، بہ مہرِ ذرّہ تا آفتاب۔

رابعہم مدرّس احمد علی صاحب، عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر، فارسیت میں برابر، فحش و ناسزا گوئی میں کم تر، جتنے الفاظ توہین و تذلیل کے ہیں، وہ چن چن کر میرے واسطے صرف کیے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے۔ صاحبِ عزّوشان ہے، عالی خاندان ہے۔ امرائے ہند، رؤسائے ہند، راجگانِ ہند سب اس کو جانتے ہیں۔ رئیس زادگان سرکارِ انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے "نجم الدولہ" خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں "خان صاحب صاحب، بسیار مہربانِ دوستاں" القاب ہے۔ جس کو گورنمنٹ "خان صاحب" لکھتی ہے، اس کو "سرطبی" اور "کتا" اور "گدھا" کیوں کر لکھوں؟ فی الحقیقت یہ تذلیل، بہ فحوائے "ضرب الغلام، اہانت المولیٰ"، گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریفِ ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا، مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا۔ میں نے منعمِ امینِ بےدین کو شیطان کے حوالے کیا اور احمد علی کے الفاظِ مذموم سے قطعِ نظر کر کے اُن کے مطالبِ علمی کا جواب اپنے ذمّے لیا۔ اس نگارش کا نام "تیغِ تیز" رکھوں گا اور بعدِ اتمام اس کو چھپواؤں گا، اور اپنے احبابِ دور و نزدیک کی خدمت میں بھجواؤں گا اور اگر مرگ نے امان نہ دی تو خیر۔ مصرع:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب یہاں سے آغازِ فصول ہے۔

داد کا طالب، غالب

[۳] ایک استفتا

اللہ اکبر! صاحبانِ قوتِ ناطقہ و قوتِ حافظہ سے کہ وہ مقربانِ مبدءِ فیّاض ہیں، غالب کی یہ استدعا ہے کہ جب یہ تحریر کہ گویا استفتا ہے، نظر سے گزرے تو اعداللغتین میں سے جو لغت صحیح ہو، اس کی صحت اور لغت غلط کی غلطی لکھ کر خاتمۂ عبارت پر اپنا نام لکھ دیں، مثلاً

جہاں میں نے لکھا کہ "چشم عیب بیں" صحیح ہے یا "چشم عیب ساز؟" (۱۴) اس کے جواب میں رقم فرمائیں کہ "چشم عیب بیں" صحیح اور "چشم عیب ساز" غلط ہے۔

یہ عبارت چھاپی جائے گی، اس واسطے ضرور ہے کہ فتوے میں توضیح ہو۔ فقط۔

سوال۱: لغتِ فارسی کی حقیقت اور حروف کی حرکت میں فردوسی اور خاقانی سچے ہیں یا ہندوستانی (۱۵) فرہنگ لکھنے والے؟

جواب: فردوسی و خاقانی سچے ہیں۔ ہندوستانی ان کے مطابق لکھیں تو سچے، ان کے برخلاف لکھیں تو جھوٹے۔

سوال۲: "پیدائی وزیبائی" صحیح اور "پیدائش وزیبائش" غلط یا یہ چاروں لفظ صحیح؟ (۱۶)

جواب: چاروں صحیح۔

سوال۳: "راندوماند" بروزنِ "چاند" صحیح۔ "رُندومُند" لہجہ ہے، اصل میں بروزنِ "تُندوکند" نہیں۔

جواب: "راندوماند" بروزنِ "چاند" صحیح، بروزنِ "تندوکند" (۱۷) لہجہ ہے۔

سوال۴: چشم کی صفت "عیب بیں" صحیح [ہے] یا "عیب ساز؟"

جواب: "عیب ساز" غلطِ محض اور جو آنکھ کو "عیب ساز" کہے وہ احمق، بلکہ اندھا۔

سوال۵: فرہنگ نویس حال کی رائے اگر فرہنگِ نویسِ ماضی کی رائے سے مطابق ہو، خواہی بہ حسبِ اتفاق، خواہی ازروے مشاہدہ، یہ سرقہ ہے یا تطابقِ رائے؟

جواب: یہ تطابقِ رائے ہے، سرقے سے کیا علاقہ۔

سوال۶: "شش ضرب نتیجۂ خوب"، شکر و عسل و گوہر وزر و مشک واقسام میوہ کو کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: معاذاللہ، لاحول ولاقوۃ الا باللہ! کون کہہ سکتا ہے مگر کوئی (۱۸) دیوانہ کہے، یعنی ان چھ چیزوں کو "شش ضرب نتیجۂ خوب" نہ لکھیں گے مگر کوئی اور چھ باتوں کو لکھیں تو لکھیں۔

سوال۷: یہ مصرع وزنِ شعر میں درست ہے یا ناموزوں؟ "چشم قاتلاں بیازند بہ تیر"

جواب: مصرع ہو تو کچھ لکھوں۔ فقرہ ہے، اس کو وزن سے کیا علاقہ؟

سوال۸: "آہنگیدن" کا صیغۂ ماضی (۱۹) "آہنگید" (۲۰) ہوگا یا فقط "آہنگ"؟

جواب: "آہنگید" ہو سکتا ہے نہ "آہنگ"۔

سوال۹: "پالوایہ" ایک لغت ہے، فرہنگ نویس کو اس کا ہم وزن "چارپایہ" لکھنا چاہیے یا "چارخایہ"؟

جواب: وزن دونوں صحیح ہیں لیکن "چارپایہ" لکھنے والا آدمی ہے اور "چارخایہ" لکھنے والا "چارپایہ"۔

سوال۱۰: "گرازاں" بہ معنیِ "خراماں" بہ کافِ فارسیِ مضموم ہے یا "کرازاں" بہ کافِ عربیِ مکسور بروزنِ "صفاہاں"؟

جواب: "گرازاں" (۲۱) بہ معنیِ "خراماں" بہ کافِ فارسیِ مضموم صحیح اور بہ کافِ عربیِ مکسور غلطِ محض۔

سوال۱۱: "کروہ و فرسخ و فرسنگ" فارسی میں "مقدارِ مسافتِ زمین" کو کہتے ہیں۔ عربی میں "کراع" بروزنِ "صراح" "مقدارِ مسافتِ زمین" کو کہتے ہیں یا "پاچہ گاو و گوسپند" کو؟

جواب: "صراح" میں بہ معنیِ "پاچہ گاو و گوسپند" لکھا ہے۔ بہ معنیِ "مسافت" غلطِ محض۔

سوال۱۲: "گلہری" بہ کافِ فارسی بروزنِ "اکھری" صحیح یا "کلہری" بہ کافِ عربیِ مفتوح بروزنِ "ابتری" صحیح؟

جواب: "گلہری" بہ کافِ فارسیِ مکسور صحیح۔

سوال۱۳: ہندوستان (۲۲) میں دخترِ نارسیدہ کو "چھوکری" کہتے ہیں، اہلِ ولایت "چوکری" کہیں گے، بہ حذفِ ہائے مضمرہ، "چکری" بہ حذفِ واو غلط ہے یا صحیح؟

جواب: "چکری" جو اہلِ ولایت سے بھی زیادہ بد لہجہ ہوگا وہ شاید کہے۔

سوال۱۴: "پا" اور "پائے" بہ اضافۂ تحتانی جس کو عربی میں "رجل" کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کا نام "پانو" مع النون ہے یا "پاو" بے نون؟

جواب: "پانو" کو "پاو" نہ کہے گا مگر مجنون۔

سوال۱۵: "پرشیدن" "مصدرِ جعلی ہے بنایا ہوا لفظِ "پریشاں" سے، خیر، ہائے زائدہ اس کے ماقبل لاکر "پہرشیدن" مثل، "پہرشیدن" بہ ہر دو ہائے فارسی بھی انھیں معنوں (۲۳) میں کہیں آیا ہے یا نہیں؟

جواب: کہیں نہیں آیا۔ اس میں ذہن کو پریشان کرنا کیا ضرور!

سوال ۱۶: "خانہ سیل ریز" شراب انگوری کو کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: "سیلِ خانہ ریز" شراب کی صفت ہو سکتی ہے، انگور کی قید بے جا اور "خانہ سیل ریز" مہمل اور غلط اور خبط۔

راقم محمد المدعو بہ مصطفیٰ (۳۴) ختم اللہ لہ بالحسنیٰ

سب جواب مجیب کے صحیح ہیں۔ الطاف حسین پانی پتی عفی اللہ تعالیٰ عنہ۔

سب جواب دونوں مجیبوں کے باصواب ہیں۔ محمد سعادت علی۔ مدرس گورنمنٹ (۳۵) اسکول، دہلی۔

ہر (۳۶) شانزدہ گانہ سوال کے جواب میں میں بھی نواب محمد مصطفیٰ خاں صاحب کا ہم زبان و ہم داستان (۳۷) ہوں۔ الراقم الآثم محمد الملقب بہ ضیاء الدین عفی عنہ۔

[۴] خطِ اُردو بنام میر ولایت علی

جناب میر ولایت علی صاحب، مہتممِ مطبعِ عظیم المطابع، عظیم آباد! (۳۸)

واسطے اپنے جد کے میری تقصیر معاف کیجیے۔ در حقیقت (۳۹) میرا گناہ نہیں۔

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

ستر برس کی عمر، حافظہ معدوم (۳۰)، نسیان مستولی۔ کل آپ کو، بہ طلبِ ترجمۂ "بوستانِ خیال" مترجمۂ صفیر بلگرامی، خط لکھا (۳۱)۔ لفافہ کرتے وقت ٹکٹ لپیٹنے بھول گیا۔ آج جو بکس کھولا (۳۲)، ٹکٹ بکس میں پائے۔ ذلیل و خوار و خجل و شرمسار۔ آج لفافۂ جدید میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ خدا کرے کہ کتاب وہاں سے پہلے روانہ ہو اور یہ لفافہ وہاں بعد پہنچے (۳۳)۔ ۱۲

۶ اپریل ۱۸۶۵ء (۳۴) نجات کا طالب (۳۵)، غالب

[۵] دو فارسی شعروں کے مطالب

(۱)

شباہتے ست مر آں را کہ برنیامدہ است
وگرنہ موے بہ باریکیِ میانِ تو نیست

سب کمر کو بال باندھتے ہیں، شاعر کہتا ہے کہ استغفر اللہ! بال کو کیا نسبت ہے کمر سے کہ نظر آتی ہی نہیں اور بال نظر آتا ہے۔ ہاں، وہ بال جو ابھی نہیں اگا اور نہیں نکلا، اس کو کچھ مشابہت ہے کمر کے ساتھ۔

(۲)

در صفحہ نبودم ہمہ آنچہ در دل است
در بزم کمتر است گل و در چمن بے ست

پھول باغ سے آیا کرتے ہیں، باغ میں ہزاروں پھول ہوتے ہیں، مجلسوں میں دس دس پانچ پانچ ہوتے ہوں گے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے مضامین پھول ہیں (۳۶) اور میرا دل چمن ہے اور صفحہ انجمن ہے (۳۷)۔ مضامین اتنے ہی نہ تھے جو دیوان میں آ گئے۔ چمن میں پھول اور دل میں معنی بہت ہیں۔

(اردو نظم)

[۶] اشتہارِ "پنج آہنگ"

مژدہ اے رہ روانِ راہِ سخن
پایہ سنجانِ دست گاہِ سخن

طے کرو راہِ شوق زودا زود
آن پہنچی ہے منزلِ مقصود

پاس ہے اب سوادِ اعظمِ نثر
دیکھیے چل کے نظمِ عالمِ نثر

سب کو اس کا سواد ارزانی
چشمِ بینش ہو جس سے نورانی

یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا
جلوۂ مدعا نظر آیا

ہاں، یہی شاہ راہِ دہلی ہے
مطبعِ بادشاہِ دہلی ہے

منطبع ہو رہی ہے "پنج آہنگ"
گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

ہے یہ وہ گلشنِ ہمیشہ بہار
بارور جس کا سرو، گل بے خار

نہیں اس کا جواب عالم میں
نہیں ایسی کتاب عالم میں
اس سے اندازِ شوکتِ تحریر
اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا، طرزِ نغز گفتاری
حبذا، رسم و راہِ نثاری
نثرِ مدحت سرائے ابراہیم
ہے مقرر جو آب بہرِ تعلیم
اس کے فقروں میں کون آتا ہے
کیا کہیں، کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلے
ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلے
ورزشِ قصۂ کہن کب تک؟
داستانِ شہِ دکن کب تک؟
تا کجا درسِ نثر ہائے کہن؟
تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب
اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے
اسداللہ خانِ غالب ہے

قول حافظ کا ہے بجا اے دوست
"ہر کرا ہیچ روز نوبتِ اوست"
کل وہ سرگرمِ خودنمائی تھے
شیخِ بزمِ سخن سرائی تھے
آج یہ قدردانِ معنی ہے
بادشاہِ جہانِ معنی ہے
نثر اس کی ہے کارنامۂ راز
نظم اس کی نگارنامۂ راز
دیکھو اس دفترِ معانی کو
سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا
سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری
کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست
تین بھیجے رُپے وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب
زرِ قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت
اس سے لیں گے کم نہ ہم قیمت

جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے
احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے

وہ بہارِ ریاضِ مہر و وفا
جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما

میں جو ہوں در پےِ حصولِ شرف
نام عاصی کا ہے غلام نجف

ہے یہ القصہ حاصلِ تحریر
کہ نہ ارسالِ زر میں ہو تاخیر

چشمۂ الطباع جاری ہے
ابتدائے ورق شماری ہے

غزل [۷]

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں واقفِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں

شکوہ سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار، کہوں یا نہ کہوں

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی اپنا
ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں در پسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں (۳۸)

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

[۸] ہجوِ سعادت علی

اے منشیِ خیرہ سر سخن ساز نہ ہو
عصفور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ
لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو

[۹] فردیاتِ اردو

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی!
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو (۳۹)

کوئی اس کا جواب دو صاحب
سانکوں کا ثواب لو صاحب

(فارسی نثر)

[۱۰] تقریظِ "قاطعِ برہان"

از من بہ من سلام و ہم از من بہ من پیام

رنجِ دلے مباد سلام و پیامِ ما

ہاں، غالبِ سپید موے سیہ نامہ ازیں بزمِ سخن کہ آراستۂ جُز خودبینی و خودنمائی چہ خواستہ؟ گفتنی کہ دانش ورانِ داد گر و ہنرمندانِ راستی پسند ازیں نہال برخورند، ندانی کہ ازیں خیابان مانا بہ بیابان بہ قولِ جامی علیہ الرحمہ۔ مصرع:

چشم نابستہ کساں کم گزرند

اے یارِ خاطرِ دانا و ناداں، در اندیشۂ دانایاں جُز گفتارِ گزشتگاں دل پسند نیست و ناداں را خود(۳۰) باہیچ سخن و سخنور پیوند نیست۔ بارے سپاسِ مردی و مہر ورزیِ آں مردمِ چشمِ مہر ورزی و مہرِ سپہرِ مردی، آں بہ دانش گراں مایہ و آں بہ جاہ بلند پایہ، آں با(۳۱) سرکشاں چوں فریدوں با ضحاک و با فرودستاں چوں سلیماں با مور، سراپا دانش و ہمہ تن بینش، منشی نول کشور بجاے آر کہ بہ خریداریِ دکان بے رونق کمر بست تا نقشِ ایں کلکِ ترہا در انطباع درست نشست۔ اگر ایں جواں مردِ بیدار دل بہ بستنِ شیرازۂ اوراقِ پریشاں نپرداختے، کاغذِ مسوداتِ "قاطع برہان" را یا کاغذ گر بردے و بہ آب آغشتہ فرو کوفتے یا سُرمہ فروش خریدے تا چکہ ہا ساختے۔ ہر آئینہ کلکِ حق گزارِ من بہ(۳۲) پایانِ آں نسخۂ منطبعہ(۳۳) از(۳۴) نبشتنِ تقریظ و تاریخ وزدنِ مُہرسہ نقشِ دیگر انگیخت تا ہیچ کس بے دستوریِ صاحب مطبع(۳۵) "اودھ اخبار" ایں سواد را در کالبد(۳۶) انطباع فرو نتواند ریخت۔ رباعی:

در قاطعِ برہاں نگر و اقبالش

کز غیب رسد ملک بہ استقبالش

بر خاتمہ نقشِ خاتم(۴۷) غالب بیں
زیں روست(۴۸) کہ گفت "مہرِ غالب" سالش (۴۹)
۱۲۷۸ھ (۵۰)

[۱۱] تقریظِ "سفرنگِ دساتیر"

اللہ اللہ! ہفتاد سال کودہ(۵۱) سال ازاں میاں بہ شمارِ دانش اندوزی از درمیاش دریوزۂ آگہی دریوزہ از درہا روے داد، بارے از درگاہِ مبدءِ(۵۲) فیاض بود ہرچہ از ہر دریافتم، مگر سخن ہاے خردی را در نا آغاز روز دایہ ناہاے(۵۳) نوشتہ اند کہ ایں خجستہ دریابش با آں ہمہ تابش درشش سُوے گیتی ہیچ گونہ یابش(۵۴) از ہیچ سُوے ندارد۔ پندارم نوی طرزِ گفتار اگر بسیار ارزد، ہم بہ ہنجارِ آفریں ہماں بہ گفتار ارزد(۵۵)، لاجرم درِ آفریں در خور را آفریں گسترے باید کہ نیروے بازگشا(۵۶) داشتہ باشد تا فرزانہ را بہ اندازۂ بایست تواند ستود، نہ چوں منِ ابلہے کہ اگر خود را نادان گویم، دانایاں(۵۷) شگفتے(۵۸) فرمانند کہ ایں دانش از کجا فراز(۵۹) آورد کہ خود را نادان دانست۔ ہرچند(۶۰) پیداست کہ ستودن بہ دانستن بازنان است و نادانستہ ستودن و ناستودنِ را(۶۱) یک فرازمان است، لاذوقِ داناستائی بردل زور آورد و زبان را خموش نگزاشت۔ بدل گفتم اگر ہمہ دگر(۶۲) آسمہ(۶۳) چہ بہ ازاں کہ ما ہم سخنے(۶۴) در مدیحِ ہم سخنے(۶۵) گفتہ باشیم۔ دیدہ ورے کُو تا بنگرد کہ امروز فرخ رُخ یوسفے را در مصرِ معنی بہ بازار آوردہ اند کہ زیبایِ جمالِ باکمالش سرمایۂ نازشِ روزگار است، نے نے پہلوی زبان(۶۶) پہلوانے را در کارگاہِ سخن بر رُوے(۶۷) کار آوردہ اند کہ استاداں استاداں را گزیں آموزگار است۔ جاماسپ مایہ(۶۸) ساساں نمایہ، آزر کیواں پایہ، مولوی نجف علی خاں(۶۹) ہمایوں خوے، ہما سایہ آں کہ روانِ(۷۰) گویا بہ پیکرش بیش(۷۱) ازاں نازد کہ پیکر ہاے دیگر بہ روانِ گویا، آں کہ نیراے(۷۲) فروغ پیراے دساتیر را بہ دستیاریِ خامہ نگلی باشامہ چناں آراست کہ لیلاے معنی در سیہ خیمۂ(۷۳) الفاظ بہ دیدارِ فرتاب پدیدارِ آں(۷۴) نامۂ ناموراز

روشنیِ چشم چشم روشنی خواست:

نگارخانۂ چیں شد درم ازیں ارتنگ
لطافتِ قلمِ نقشبند را میرم
ہم آں دبیرِ رواں تازہ ساز را نازم
ہم آں سوادِ سویدا سپند را میرم

خوانندگانِ ایں نگارش را بر(۷۵) غالبِ سیہ نامہ رویِ خود نمائی در اندیشہ نگزرد۔ من کہ آں زار نزار(۷۶)، از زیستن در آزار، از کاست بیزار را یکے از رازدانانم، گویم کہ چوں حسنِ عبارت نگرست و دانست کہ روے خوب را چشمِ بد در کمین و کمال را عین الکمال بہ دنبال است، بہ چشمداشتِ دفعِ گزندِ چشم زخم سودمند(۷۷) حرزے نبشت۔ یارب، ایں نگاشتہ چشم پنامِ آں سفرنگِ با فروفرہنگ بادو بداں شرِ نورس دستِ تاراج ہیچ ہرزہ مرس مرساد۔

[۱۲] تقریظِ "دری گشا"

یزدانِ رواں بہ خردفروزو بہ گروہا گروہ(۷۸) مردم زبان ہاے جداگانہ آموز، ہر زبان را زباں دانے(۷۹) پدید آور(۸۰) و ہر گنجینۂ در بستہ را کلید آور(۸۱)، دریں روزگار پارسی(۸۲) گفتار را دانائے آفرید، نے نے قلمروِ زبانِ دری را(۸۳) دارائے آورید کہ نخست شرحے دل پذیر بر دساتیر نگاشت، سپس(۸۴) بہ نبشتنِ فرہنگِ لغات ہمت گماشت۔ ازاں رو کہ اسم سامیِ(۸۵) مولینا و بالفضل اولینا بہ زبانِ پرویں فشانِ کلکِ خودش(۸۶) در روگاہ مذکور است، بے صرفہ برونِ نام نامیش از ادب دور است۔ غالبِ دانش جوے آں ہمی گوید کہ من کہ(۸۷) بہ ستایش گری و فرماں بریِ احباب کار از پیش می برم و فرجامِ کار لفظے چند، نوآئیں پیوند در گیتی یادگار گزاشت، معنی باخویش می برم بہ سیہ مستیِ بادۂ سوادِ عبارتِ دیباچۂ فرہنگ بیخودانہ یللے سرائے و بدیں آفریں گستری آفریں شاے(۸۸) شدہ ام۔ گفتارِ مرا حسنِ قبولیِ روزی باد۔

(فارسی نظم)

[۱۳] نامۂ منظوم بنام جوہر

وفا جوہرا! از تو غم دُور باد
دلت سرخوشِ بادۂ سُور باد
رسید، از تو الفت فزا نامۂ
رواں تازہ کن، دل گشا نامۂ
نخواہم کہ در عرصۂ روزگار
نشیند ترا بر دل از غم غبار
ز رنجوریِ من مخور غم کہ من
ندارم غمِ ہستیِ خویشتن
نہ جاں از من است و نہ جسم آنِ من
خود از مردنِ من چہ نقصانِ من
حدیثے ست شایستہ و سُودمند
ز شایستگی بودہ داناپسند
ازاں کس کہ فرزندِ اوئی، شنو
گر از من نباشی(۸۹)، نکوئی شنو (۹۰)
چنیں(۹۱) دادہ فرماں کہ در ساز راہ
نباشی بہ حیلت گری عذرخواہ

عزیزانِ رہرو گرامی کنند
بہ شادی دراں ناحیت می رسند
بہ شادی بدیں(۹۲) جمع انباز گرو
چو گروند اینان، تو ہم باز گرو
الا تا نہ سنجی(۹۳) کہ ایں زاں بہ است
چنیں خواستت آں کہ فرماں دہ است
مشو سخت کوش و مشو سخت گیر
دریں آمدن باش فرماں پذیر
بہ حکمِ پدر چوں گزیدی سفر
بگرو از سفر ہم بہ حکمِ پدر
دریں رفتن و(۹۴) آمدن شاد باش
بہ تبعیت از طعنہ آزاد باش
ز ہجرِ تو مادر بہ تاب اندر است
گدازاں چو شکر در(۹۵) آب اندر است
پدر نیز مشتاقِ دیدارِ تست
بہ صد گونہ خواہش طلبگارِ تست
ترا خواہد، از بس کہ خواہد ترا
نخواہد گر او(۹۶) پس کہ خواہد ترا؟
بیا و دو خونیں جگر را ببیں
بہ مادر نشیں و پدر را ببیں

دگر من چراغِ سر گاہیم
قدم نہ بہ راہِ ہوا خواہیم
بیا، تا ببینی کہ چوں می تپم
چساں(۹۷) دیدہ تا دل بہ خوں(۹۸) می تپم
بیا، تا تنم غرقِ خوں بنگری
درونِ مرا از بروں بنگری (۹۹)
بیا و بیا و بیا و بیا
سر آمد سخن، والدعا، والدعا
بخواں چوں بخوانی ورق را تمام
ز نیّر سلام و ز عارف سلام

[۴۱] تین معمے

(۱)

بر بدِ خویشتن بدوزد چشم
بندہ خواہد رسیدن ار بہ خدا

(۲)

دو نیمہ گشت کلام از مہابتِ نامش
سرش بجائے خود و باز گونہ اندامش

(۳)

نیم شب یخ بستہ دیدم برگزرگاہِ خرام(۱۰۰)
بر سرِ آبے کہ بودش درمیانِ کاف و لام(۱۰۱)

[۱۵] رباعی

نامِ اب و جدّ و عم نگیرند ایں قوم
فیض از دمِ مادراں پذیرند ایں قوم
از مادر و از مادرِ مادر گویند
[کس] در [کس] اسیر ابنِ اسیرند ایں قوم

[۱۶] فردیاتِ فارسی

(۱)

ایں لسنہ کہ ہست رشکِ ارتنگ
سرچنگ بود برائے خرچنگ

(۲)

لاجرم می سزد کہ نکتہ وراں
نامِ بسمل نہند(۱۰۲) ہیرا مَن

حصّۂ دوم

(خطوطِ فارسی)

[۱] بنام مرزا احمد بیگ تپاں

(۱/۲)

جنابِ مستطاب فیض مآب مرزا احمد بیگ خاں صاحب مدظلہ العالی، معروض ایں کہ رقعۂ بندہ موسومۂ جناب مولوی سراج الدین احمد صاحب، ملفوفِ عریضۂ نیازِ ہذا، می رسد، توقع کہ رقعۂ دعوتِ شادی از طرفِ خود بہ اسمِ مرزا اکبر بیگ صاحب نوشتہ، در رقعۂ موسومۂ سراج الدین صاحب ملفوف ساختہ، بہ آدمِ من بدہند و بگویند کہ رفتہ بہ مہدی باغ برساند۔ چوں کہار کہ حاملِ عبودیت نامہ است، بہرہ از خرد نداشت، دانستم بدیں ہمہ بہ پیشِ جناب (کذا) مدعا چناں کہ باید، فرا نخواہد رسید۔ ناچار رقعۂ موسومۂ مولوی سراج الدین احمد صاحب در نوردِ عریضہ فرستادہ شرحِ آں بہ جناب رقم زدم و کہار را مامور بہ تقدیمِ احکامِ جناب ساختم۔ فقط۔

رقعہ بنام مولوی صاحب برائے آنست کہ کہار خانۂ مرزا اکبر بیگ صاحب نمی داند۔

[نگاشتہ: مابینِ ۳ و ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابقِ ۱۹ و ۲۳ فروری ۱۸۲۸ء]

(۲/۹)

عاجز نوازا! والانامہ رسید و حال حالی گردید۔ من آں نہ می خواستم(۱) کہ ایں رسم بہ

محفل ادا کنم، زیرا کہ در شہرِ خویش چنیں ندیدہ ام کہ در شادیِ بسم اللہ در محافل و مجالس بہ دست طفل چیزے دہند۔ آرے، بہ تقریب ختنہ ایں چنیں بہ عمل می آید، لیکن در شادیِ مکتب نشینی دو رسم در دیارِ خویشتن دیدہ ام۔ یکے آں کہ ملاّے کہ طفل را سورۂ "اقرأ (۲) باسم ربک"، بہ خواندن می دہد۔ اعمام و اخوانِ طفل چیزے بہ ملاّ می دہند فقط۔ دوم ایں کہ خوانہاے میوہ یا نقد بہ طریقِ شگونِ تہنیت می فرستند فقط۔ پس ہر گاہ رسمِ نذرِ ملاّ دریں دیار نیست، آں را چرا باید کرد، مگر ارسالِ میوہ و نبات بہ خانہ کہ رسمِ برادریست۔ چوں مسافرم و اسباب و آلات نہ دارم، ہر آئینہ نقد آں چہ بہ ضمیرم خواہد گزشت، خواہم فرستاد، و معذرت ہاے جناب در آں باب نہ خواہم شنید۔ فقط۔

طلبِ اشخاصِ معلومہ اگر بہ خاطری رسید، بزشت نہ بود۔ من ہم مصلحۃً نوشتہ ام، ابرام و مبالغہ ندارم۔ اگر مناسب دانند رقعہ کہ صبح بہ توسطِ خاں صاحب مخدوم بہ خدمت رسیدہ است، ایں زماں بہ دستِ آدمِ خویش بہ خدمتِ مولوی صاحب مخدوم جناب مولوی سراج الدین احمد صاحب بفرستند و رقعہ از طرفِ خود بنویسند کہ اسد اللہ غالب ایں چنیں بہ من نوشتہ است، صلاحِ صاحب چیست؟ بنگریم تا مولوی صاحب ممدوح چہ می فرمایند، و ایں قدر ہم موقوف بہ رضاے جنابست، اگر بہ خاطر بگزرد، فبہا ورنہ:

صلاحِ ما ہمہ آنست کاں صلاحِ شماست

زیادہ نیاز۔ اسد اللہ اسد

[نگاشتہ: ما بینِ ۳ و ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابقِ ۱۹ و ۲۳ فروری ۱۸۲۸ء]

(۳/۳)

جنابِ رافت انتساب قدومی و مطاعی مرزا احمد بیگ خاں صاحب دام مجدہٗ۔ مخدومِ من!

شبِ شادیِ نورِ چشم محمد علی خاں اتفاق آں افتاد کہ چوں نیمے از شب سپری گشت، بہ خانۂ خویش آمدم، لیکن چوں خود را مہمان نہ می شمردم و تکلف درمیان نہ بود، بہ تودیع نہ پرداختم و بے خبر برخاستم، بل کہ قدومی جناب ابو القاسم خاں صاحب خبر دارند بالجملہ آں دو پاسِ

شب در غنودن بسر بردہ، پگاہ برخواستم و بہ ہوگلی رفتم و دو روز و دو شب در آں جا آرمیدہ (۳) و روز، کہ دوشنبہ بود، آخرِ روز بہ کاشانہ باز آمدم۔ قدومی نواب علی اکبر خاں سلام گفتہ اند و تہنیت رسانیدہ اند۔ ایں بود اخبارِ آوارگی ہاے شوق کہ گفتہ شد۔

امیدوارِ آنم کہ از صحت و عافیتِ مزاجِ خود و صاحبزادہا آگہی بخشند۔ نیازست و بس۔

اسد اللہ

[نگاشتۂ سہ شنبہ، ۱۱ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابقِ ۲۶ فروری ۱۸۲۸ء]

(۴/۲۹)

نوازش نامہ ورود نمود و آبروے خاکساری ہایم افزود۔ ہر سہ مطلع را ارواحِ ثلاثہ کالبدِ دعویٰ ساختہ بہ احتیاط نگہ داشتہ ام۔ بہ خاطر می گزرد کہ روزے چند صبر باید کرد و در محفلِ مشاعرہ آیندہ بہ بانگِ بلند باید خواند، تا اہلِ انجمن بشنوند و رسوائیِ معترض و گراں مائگیِ معترض (۴) برہمہ آشکارہ گردد۔ دیگر از سپاسِ عنایتِ جناب و تشکرِ تفقداتِ جنابِ مستطاب مرزا ابوالقاسم خاں صاحب چہ عرضہ دارم کہ از حوصلۂ کام و زباں بیش [است]، ناچار آں را حوالہ بہ دل و جاں کردہ ام۔ آداب و تسلیم و عرضِ سپاس از جانبِ ایں حقیر حق شناس بہ خدمت عرضہ دارند۔ فقط۔

[نگاشتۂ مابینِ یکشنبہ ۶ جولائی ۱۸۲۸ء، مطابقِ ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ و یکشنبہ ۳ اگست ۱۸۲۸ء، مطابقِ ۲۱ محرم ۱۲۴۴ھ]

(۵/۳۱)

قبلۂ من! ندانم از سادہ لوحی ہاے من است یا در واقع نیز ہم چنیں است کہ ملازمان و خدمت گارانِ سامی را ملازم و خدمت گارِ خویشتن می دانم۔ سہ روز است کہ ہر روز آدمِ من می رسد و جانور را تاکید می کند، و ہر روز تا شام انتظارش می کشم۔ نیچہ ہا از ہم فرو ریختہ۔ نزدِ من آدم

کجا تا کار سرانجام دہد۔ یک کہار و دو خدمت گار با خود دارم، از دیار و اہلِ دیار بیگانہ۔ ستم است اگر دریں تنہائی و بے کسی شما نیز چارہ ساز و غمخوارِ من نباشید۔ گرفتم کہ جانو عذر پیش خواہد آورد کہ نیچہ بند را نیافتم۔ مرا نیچہ بند درکار نیست، جانو را بفرمائید تا تصدیعہ (کذا) کشیدہ، نزدِ من بیاید، تا نیچہ ہا بہ وے بسپارم و بہ طریقے کہ درستی منظور دارم، بہ وے بفہمانم تا کار رواں گردد۔ امروز ایں وقت سوارہ بہ لنالی می روم، اگر وقت مساعد شد، سرِ شب بہ ملازمت خواہم رسید۔ بہ ہر حال فردا بامداداں جانو نزدِ من بیاید۔ زیادہ حدِ ادب۔

اسد اللہ خاں، فقط۔

[مابینِ یکم و ۹ صفر ۱۲۴۴ھ مطابقِ ۱۳ و ۲۱ اگست ۱۸۲۸ء]

(۶/۴۳)

شکوۂ بے پروائی ہائے خدمت گارِ سرکار بیش از آنست کہ بہ تحریر آید و بہ تقریر گنجد، تاچار نیچہ بند را بہ جانو و جانو را بہ خدا سپردم۔ فقط۔

نخست خیر و عافیتِ نور العین محمد علی طال اللہ عمرہٗ بفرستند کہ جاں بیارامد و دل بیاساید، پس لزاں رقعۂ موسومہ خود را سر تا سر بہ تامل بنگرند و سراپائے آں بگزرند وانگاہ در بیاضِ خویش نقل کردہ اصلِ مکتوب را از ہم بدرند، و بہ آب و آتش دہند۔ زیادہ نیاز، فقط۔

[صفر ۱۲۴۴ھ مطابقِ اگست ۱۸۲۸ء]

(۷/۴۴)

جناب مرزا صاحب والا مناقب، ستودہ شیم، مجمعِ لطف و کرم زاد عنایتہ! پس از اعلانِ التزامِ شیوۂ تسلیم معروض ایں کہ مجموعۂ نثرے کہ فرستادہ بودند، از نظر گزشت، و تا دیدہ بہ سوادِ آں بیاض آشنا گشت، حیرتے چند روے داد کہ توضیح آں ضرور افتاد، لیکن از آنجا کہ فارغِ ہنگامہ و عزم تحریر داوری نامہ نہ داریم، شرط کردہ ایم کہ دریں صفحہ بہ آرایشِ عبارت نہ گرائیم و متصدیِ جوابِ اعتراضات نہ شویم، تا ہر کہ بیند، بداند کہ ما را التفات بہ جوابِ

دردے در مقابلہ نیست۔ مختصر مفید، در آں اوراق مرقوم دیدہ ایم کہ ایں مصرع:

نگاہش از درازی ہاے مژگاں بر نمی آید

وہم چنیں ایں شعر:

کردم آں نالہ کہ تا شب اثرے باز نہ داد

بے معنی است۔ انتہی کلامہٗ۔ ہیہات از "درازی ہاے مژگاں" چہ معنی دارد و "کردم آں نالہ" یعنی چہ؟ بندہ کاغذے کہ در مشاعرہ بہ دستخطِ بندہ گزشتہ است، نیک بنگرند کہ مطلع ایں گفت:

نہ از نازست کز چشمِ وے آساں بر نمی آید

نگاہش با درازی ہاے مژگاں بر نمی آید

و شعر ایں گفت:

آہ ازاں نالہ کہ تا شب اثرے باز نہ داد

بہ ہم آہنگیِ مرغانِ سحر خواں زدہ

مدعا ایں کہ شعر را غلط دانند، تا غلط نہ خوانند۔

دیگر ہم در آں صحیفہ مندرج بود ست کہ "گذاشتن و گذشتن و پذیرفتن بہ زاے "ہوز" نوشتن غلطیِ املاست۔" نکتہ شناسا! غلطیِ املا وقتے می تواں گفت کہ [نویسندہ] دانا بداں نباشد و سہو در تحریر افتد۔ حال آں کہ تحقیقِ ما براے ما کافی و در نفسِ خویش تمام است۔ اگر بپذیرند، از شادی نہ بالیم و اگر خردہ گیرند از اندوہ نہ نالیم۔ طرزِ تحریر را غلطیِ املا گفتن غلط است۔ آرے اگر غلطیِ تحریر گویند، خصومتے نیست۔ بالجملہ غلطیِ املا آنست کہ مثلاً "ولد الحرام" را کسے بہ ہاے "ہوز" انشا کند و "ثالث" را بہ ہر دو سینِ مہملہ بنویسد، یا ہم چنیں "اعتراض" را بہ زاے "ہوز" نگارد و "ضبط" را بہ تاے "قرشت" رقم زند، و قس علیٰ ہٰذا۔

حق خدا کہ مطلب از تحریر ایں عریضہ عرضِ شکایت نیست، چناں کہ خود در صدرِ نامہ شرح دادہ ایم۔ خامہ فرسائی در ہواے آنست کہ فرا رسیدگاں وارسند و دریابندگاں دریابند۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔ راقم ننگِ آفرینش اسد اللہ۔ فقط۔

[اگست ۱۸۲۸ء، مطابقِ صفر ۱۲۴۴ھ]

(۸/۲۸)

پشت پناہِ بے کسی ہاے من! دلم بہ حالِ محمد علی خاں و برادرش(۵) نگراں است، امید کہ دریں شبانروز فرصتے یافتہ باشند، بہ فرستادنِ نویدِ عافیتے جان در تنم دمند و از پیچ و تشویش نجات بخشند۔ فقط۔

[صفر ۱۲۴۴ھ مطابقِ اگست ۱۸۲۸ء]

(۹/۲۰)

قدوم و مطاعِ من! سلامت۔ امروز کہار براے آب آوردن بہ لعل ڈگی رفتہ۔ چوں صبح دم است، ہر دو آدم دیگر دست بہ کارے زدہ اند، ناچار کودک کہار را بہ ذریعۂ عبودیت نامہ بہ آستاں بوس فرستادہ است۔ چہ خوش باشد کہ ملازے از ملازمانِ درِ دولت یا اوراقِ "جامِ جہاں نما" ہمپاے کودک کہار تا من برسد کہ حالِ رزیڈنٹ (کذا) دہلی ازاں اوراق دریافتہ ہم چناں بہ خدمت باز فرستم، و اگر ہم بہ دستِ کودکِ کہار خواہند فرستاد، آں ہم چنداں سو و بیم و باک نہ خواہد بود۔ زیادہ نیاز۔ فقط۔

امید کہ زحمتِ دست و قلم کشیدہ، مژدۂ خشنودیِ مزاج رقم فرمایند کہ دلِ شوریدہ بیارامد و جانِ جوایشہ بیاساید۔ والسلام خیر ختام۔

اسد اللہ۔ فقط۔

[جنوری ۱۸۲۹ء مطابقِ رجب ۱۲۴۴ھ]

(۱۰/۱۱)

والا قدرا! اوراقِ "جامِ جہاں نما" رسید۔ مدعا بہ حالِ صاحب رزیڈنٹ (کذا) دہلی رسیدنی بود، معلوم شد کہ ہنوز در الور است۔ اگر از آں جا بہ جانب جے پور و جودھ پور رفت، [زمانے] دراز باید، تا معاودت نماید، و اگر از آں جا برگردد، ہر آئینہ زود تر درستیِ کار متصور است۔

بالجملہ آں اوراق را دیدہ، ہم چناں بہ حاملِ نوازش نامہ سپردہ شد۔ دوشالہ نیز بہ دستِ وے فرستادہ آمد، خواہد رسید۔ زیادہ نیاز۔

چہ تماشاست کہ اجزائے "گلِ رعنا" نہ مرا بہ یاد آمد و نہ جناب فرستادند و لینک نیز بعدِ تحریرِ عریضۂ ہذا بہ خاطر گزشت۔

اسد اللہ

[جنوری ۱۸۲۹ء مطابقِ رجب ۱۲۴۴ھ]

(۱۱/۵)

بہ ملیینِ عنایتِ مخدومی و مطاعی و ملاذی جناب مرزا احمد بیگ صاحب دام لطفہٗ مقرون باد!
بہ عزِ عرض می رساند، امروز بہ وقتے(۷) کہ می بایست، نخست بہ دفترخانہ رسیدہ و از آں جا بہ بارگاہ رفتہ شرفِ ملازمت جناب لارڈ (کذا) صاحب ہم رسانیدہ شد۔ امروز نیز چوں روزِ گزشتہ بہ پاسِ خاطرِ جناب مرزا افضل بیگ صاحب و حضرت مولوی سراج الدین احمد صاحب ہم دریں جا اتفاقِ جیت(۸) افتادہ است۔ ان شاء اللہ تعالیٰ فردا تا نیمہ روز [بہ] کلبۂ احزانِ خویش رسیدہ خواہد شد۔

دوشالہ برائے محفل، کہ رقعہ اش رسیدہ است، داشتہ شد و دستار، چوں حاجت بداں نبود، بہ خدمت فرستادہ آمد۔ زیادہ جز تسلیم چہ بر گزارد۔

محمد اسد اللہ

[مرقومہ دو شنبہ، ۱۲ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابقِ ۱۶ فروری ۱۸۲۹ء]

(۱۲/۷)

مخدوما مطاعا دام مجدہٗ! حالِ تقریرِ بزمِ طرب ہنوز حالی نہ گشت، امید کہ از کیفیتِ زمان و مکاں بیاگاہانند۔ دیروز کتابتِ مخدومی نواب علی اکبر خاں کہ دلم صیدِ نوازش ہائے اوست، از ہوگلی رسیدہ است۔ بیمار اند و مرا برائے عیادت طلبیدہ اند۔ می خواہم کہ روم و ہفتہ در آں جا باشم۔ ہمانا کہ از برائے آں می پرسم کہ اگر چہار شنبہ حال کہ بس از پنج روز می آید، روزِ انعقادِ

انجمن قراریافتہ باشد، در رفتن درنگ کنم و بعد از چہار شنبہ روم و احیاناً اگر محفل آرائی در ماہِ رمضان قراریافتہ باشد، زود بروم و تا ہنگام کار باز آیم۔ امید کہ ازیں عالم [آنچہ] مکنونِ ضمیرِ منیر باشد، بہ اظہارِ آں شادان و آرمیدہ دل سازند۔ زیادہ نیاز۔

اسد اللہ

[نگاشتۂ جمعہ ۲۳ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابقِ ۷ فروری ۱۸۲۹ء]

(۱۳/۴)

جناب فیض مآب حضرت مرزا احمد بیگ خاں صاحب دام اشفاقہ! عالی جناباً! مکتوب موسومۂ خواجہ فیض الدین حیدر صاحب می رسد۔ امید کہ در نوردِ رقائم جناب بہ جہانگیر نگر رواں شود۔ ملتمس آں کہ عزیزے از راہ دور با(۹) آں کہ توفیرِ مجھتے بہ میاں نیست، مہربانی نامہ فرستادہ، اگر جواب نخواہد رسید، بر بے دماغیِ راقم گمان خواہد کرد۔ ہمانا کہ من آں می خواہم کہ جنابِ خاص از برائے ایں مکتوب کتابتے سر انجام دادہ، رواں فرمایند کہ منت بر من خواہد بود۔ زیادہ نیاز۔

اسد اللہ خاں

[نگاشتۂ یک شنبہ ۲ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابقِ ۸ مارچ ۱۸۲۹ء]

(۱۴/۱)

قبلۂ من! نوازش نامہ جاں را بہ نویدِ عنایت بنواخت، و رسیدنِ دستار سر فراز ساخت۔ مرقوم بود کہ امروز بہ محفل باید رسید۔ خواہم رفت، امّا بہ شرطِ آں کہ جناب آخرِ روز انتظارِ ورودِ من کشند، چہ ہر گاہ ساعتے از روز باقی خواہد ماند، سرقدم خواہم ساخت(۱۰) و بداں محلہ رسیدہ نخست سعادت پابوسیِ حکیم صاحب خواہم اندوخت و پس از آں بہ ملازمتِ جناب رسیدہ بہ معیتِ ملازمان بہ انجمن خواہم رسید۔

آں کہ در بابِ محاورہ استفسار فرمودہ اند، حال ایں است کہ "قدم از سر ساختن" و "سر را قدم ساختن" و "سرقدم [ساختن"(۱۱)] افادہ معنیِ متحد می کند، و در کلامِ اہلِ زباں بدیں ہر سہ

شیوہ بہ نظرِ راقم رسیدہ است۔ لہٰذا ایں قدر می دانم کہ بہ مذاقِ اہلِ ہند "قدم از سر ساختن" بہ سببِ سہولیت (کذا) استخراجِ معنیٰ ملائم تر خواہد بود۔ فقط۔

جوابِ فقرۂ کہ در وسطِ عنایت نامہ مرقوم بود، مجمل اینست کہ آں جزوِ واحد را دو بہرہ نشاید کرد و شمارِ آں عنایت را کمتر نتواں ساخت۔ سعی در آں باید کرد کہ ہر چہ مطلوبست، پیش از عید یک مشت بہ من برسد۔ دیگر تفصیلِ ایں را عندالملاقات تحویلِ سامعہ خواہم ساخت۔ زیادہ نیاز۔

اسداللہ

[مرقومہ چہار شنبہ، ۲۶ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابقِ یکم اپریل ۱۸۲۹ء]

(۱۵/۱۰)

قبلۂ من! دو شالۂ سبز کہ پریشب از ملازماں آوردہ بودم، اینک بہ دستِ کہاری رسد، رسیدہ باد۔ دیگر، نیاز نامہ موسومۂ جناب فیض الدین حیدر صاحب سلّمہم اللہ تعالیٰ مرسل است۔ بہ توجہِ ملازمے از ملازمانِ جنابِ سامی از نظرِ مکتوب الیہ گزشتہ باد۔ دیگر آں کہ وعدہ داشتم کہ ہر گاہ بہ بلاے نزلہ و زکام مبتلا خواہم شد، چاشنی گیرِ مذاقِ برشعشا، کہ بالفعل بہ "برش" معروف است، خواہم شد۔ اینک آں نزلہ و آں زکام، امید کہ بہ قدرِ یک تولہ از آں مرکب عنایت شود، تا دو سہ روز بہ اکل آں مبادرت نمایم (۱۲) زیادہ نیاز۔

اسداللہ

[محررہ ششم صفر، روزِ آدینہ، ۱۲۴۵ھ مطابقِ ۷ اگست ۱۸۲۹ء]

(۱۶/۲۵)

مخدوما، اتفاق چناں افتاد کہ بندہ را دو سہ روزِ دیگر در کلکتہ باید بود۔ فردا روزِ جمیل نیست، یقین اگر مانعے رو ندہد، بہ روزِ پنج شنبہ بہ زورق خواہم نشست۔ چوں دیدم کہ ہنوز فرصتم باقیست، امروز بہ خدمت نہ رسیدم و رفتن بہ جاہاے معلومہ موقوف داشتم۔ ان شاء اللہ العظیم بہ روزِ یک شنبہ باہم دگر تودیع بہ میاں خواہد آمد۔ زیادہ نیاز۔ امید کہ از حالِ مرزا غلام حسین

اطلاع بخشند- دیگر از روانگی مکتوب ڈھاکا بیاگاہنند- دیوانِ قصوری علیہ الرحمہ اغلب کہ بہ خوابہ مستقیم صاحب رسیدہ باشد- والسلام والاکرام- فقط- د.

[مرقومہ روزِ شنبہ، چہاردہم صفر ۱۲۴۵ھ و پانزدہم اگست ۱۸۲۹ء]

(۱۷/۱۷)

قبلۂ من! عنایت نامہ رسید و حال حالی گردید- بندہ را در طعام امروزہ دو عذرِ صریح است- یکے ایں کہ بہ شب مبادرت بہ اکلِ غذا نمی کنم ہرگز، دوم امروز روزِ یک شنبہ است، از اکلِ لحم اجتناب دارم و اگر چنیں نبودے، بر طرفِ مائدہ می نشستم و استخواں ریزہ و کباب بے می خوردم- امید کہ بہ ہر صورت معاف دارند، مگر برائے بندہ قدرے از اولوش (کذا) نگاہ دارند- فردا بہ وقتِ صبح بہ خدمت رسیدہ و چیزے (۱۳) خوردہ رخصت خواہم شد و بہ دریا رفتہ بہ زورق خواہم نشست و روانہ خواہم شد- امروز حاضر شدنِ من بہ ہیچ نوع ممکن نیست، زیادہ بندگی- مولانا سراج الدین احمد صاحب سلام می رسانند- فقط-

[نگاشتہ یک شنبہ ۱۵ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۲۹ء]

(۱۸/۶)

مخدومی مکرمی جناب مرزا صاحب، مکرمِ مناقب زاد عنایتہ! سخنِ لطیف بہ خاطر رسیدہ است، خواستم کہ بہ خدمت رسیدہ بہ معیتِ جناب بہ دولت خانۂ راو صاحبِ والامناقب، راو شیورلو صاحب حاضر شوم لیکن تاملِ عناں گیرِ شوق گردید کہ خلوتے، چناں کہ باید، دریں ہر دو جا میسر نہ خواہد آمد، لہذا معروض می دارد کہ رقعۂ ہذا را بہ خدمتِ راو صاحب رسانیدہ و جنابِ شاں را از استدعاے من آگاہانیدہ، خواہ آخرِ روز، خواہ اولِ شب، جنابِ سامی و راو صاحب بہ کلبۂ احزانِ راقم قدم رنجہ فرمایند- دریں باب تغافل بہ میاں نیاید- زیادہ جز نیاز چہ گزارد-

عاصی اسد اللہ

[دورانِ قیام کلکتہ]

(۱۹/۱۳)

عالی جنابا۔ دام لطفہٗ! بہمار بہ ذریعۂ عبودیت نامہ بہ خدمت می رسد۔ امید کہ بر رحم علی بفرمایند کہ دستار از دستار بند بہ بہمار و وجہِ دست مُزد از بہمار بہ دستار بند بدہانند۔ زیادہ نیاز است نیاز۔

اسد اللہ

[دورانِ قیامِ کلکتہ]

(۲۰/۱۹)

مخدومِ من، سلامت! ہفتہ ہاست کہ چشم از دیدن و گوش از شنیدن محروم است۔ پوشیدہ نماند کہ جناب مولانا سراج الدّین احمد مد ظلہ العالی چنگ بہ دامنِ استبداد در زدہ، مرا باخویش در ہنگامۂ برجو تالاب بردہ بودند۔ گمان ہا داشتم کہ جنابِ مخدومی نیز بہ تقریبِ سیرو تماشا آمدہ باشند۔ ہر چند من و مولانا دریں آرزو پردۂ انبوہِ خلق از ہم شگافتیم، از گردِ راہِ ملاناں اثرے نیافتیم۔ بالجملہ لختے از واماندگی ہائے خویش در عتابم کہ چرا بہ خدمت نرسیدم و ہم چناں پارۂ از تغافل و استغنائے جناب در صد ہزار گونہ پیچ و تابم کہ دریں دہ دوازدہ روز خبرم نہ گرفتند کہ فلانے راچہ پیش آمد و کجا رفت۔ بہ ہر رنگ سلامت باشند و دیر بمانند۔ فقط۔

فقط اسد اللہ

[دورانِ قیامِ کلکتہ]

(۲۱/۳۶)

قبلۂ من! سپاسِ ایں ہمہ مہربانی کہ پس از عمرے بہ یادم آوردہ اید، جز بہ سپری کردن عمرے نتواں کرد(۱۴)۔ دانم کہ از عمر(۱۵) اندکے ماندہ است، ہر آئینہ آں سپاس را [کما] از گزاردنِ آں قطعِ نظر نتواں کرد۔ از(۱۶) کام و زباں(۱۷) بدر می کشم و بہ مغز دل و جاں می

اگنم تا [نا(۱۸)] گزاردہ نماند و بے یاریِ کام و زباں ادا کردہ شود۔ بے کساں را یاد می آورید و رُوسیہاں(۱۹) را بہ نامہ شاد می کنید۔ یارب! دیر بمانند(۲۰)۔ از درون و بیروں، یعنی ہم بہ دل و [ہم بہ(۲۱)] زباں بہ فرزندانِ ارجمنداں(۲۲) (کذا) دعا(۲۳) رسیدہ باد۔ فقط۔

[ہشتم شوال و روزِ آدینہ ۱۲۴۵ھ مطابقِ ۳۰ اپریل ۱۸۳۰ء کے بعد]

(۲۲/۲۷)

تنت بہ نازِ طبیباں نیازمند مباد
وجودِ نازکت آزردۂ گزند مباد

قبلہ و کعبہ! روزے چند ازیں پیش قدسی صحیفہ بہ توسطِ حکیم صادق علی خاں بہ من رسیدہ است(۲۴)۔ ہنوز پاسخ نگزاردہ بودم کہ امروز چہارم ستمبر و ندانم چندمِ(۲۵) ربیع الاول است، نامہ از نزدِ قبلۂ نیکواں، مولوی سراج الدین احمد(۲۶) رسید [و(۲۷)] انکشافِ حالِ ناسازیِ مزاجِ مبارک اندوہ ناکم ساخت۔ چوں ہم در آں دل کش رقیمہ طراز [حرف(۲۸)] و رقم داشت کہ حالیا بہ حسنِ تدبیرِ قبلۂ صورت و معنی حضرت حکیم احد علی(۲۹) پارۂ افاقتے و امیدِ فراغتے دست بہم دادہ(۳۰) است۔ واللہ کہ ہم بہ قدرِ آں افاقت(۳۱) مرا ہم از ہجومِ الم فرصتے بودہ است۔ برائے خدا ازیں زار نظر قطع نخواہید کرد و زود نویدِ صحت خواہید فرستاد کہ زیں سپس در انتظارِ ورودِ نامہ روز خواہم شمرد۔

در نامہ کہ حکیم صادق علی خاں(۳۲) بہ من رسانیدہ اند، انقطاعِ علاقۂ ہوگلی و عزمِ انقطاعِ(۳۳) علاقۂ(۳۴) جہانگیر نگر و ملال از کلکتہ و احرامِ دارالخلافت دہلی مرقوم بود۔ ہرچند ورودِ ملاذناں بہ دہلی سرمایۂ جہاں جہاں طرب ست، اما ملول بودن از کلکتہ چہ غضب است؟ واللہ(۳۵) دہلی شایستگیِ آں ندارد کہ آزادہ در وے خاک نشیں تواند بود۔ خاص و عامِ ایں بقعہ بے سبب آزار و مردہ زنِ ایں تیرہ بوم مردہ خوار۔ بہ خاطر دارم کہ چوں ایں داوری بہ پایاں رسد، بہ بہانۂ ازیں شہر برآیم و کلکتہ را دریابم(۳۶)۔ بہ عزیزاز جاناں(۳۷) دعائے طولِ عمر و افزونیِ دولت مقروں باد(۳۸) فقط(۳۹)۔

[نگاشتہ ۴ ستمبر ۱۸۳۰ء مطابقِ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۶ھ]

(۲۳/۲۲)

قبلۂ من! (۳۰) فرمانِ شما بر جان و دلم رواں است۔ بہ ہر چہ گوئید (۳۱)، بہ سر (۳۲) شتابم و بہ فرق پویم، لٰکن شما از شیوہائے مردمِ دہلی آگاہ نیستید۔ چنداں کہ جہد در ادراکِ حالات می کنم، مردم از من می ترسند (۳۳) و از (۳۴) شما بدگماں می شوند [و می پندارند کہ (۳۵)] مرزا احمد بیگ خاں اسد اللہ را از جانبِ خود بر آں گماشتہ اند کہ رفتہ رفتہ در مجموعِ امور دخل و تصرف کند۔ خدائے را (۳۶) خود را بدنام و مرا رسوا مکنید۔ مرد (۳۷) خردمند را باید کہ اگر فی نفس الامر در پے امرے باشد، خود را چناں فارغ و لاابالی وانماید کہ کس از رازش آگاہ نگردد، نہ کہ مثلِ شما صاف دل و فارغ بال گردد کہ (۳۸) باوصفِ بے طمعی و آزادی خود را در نظرِ مردم "آقا ذوطماع" قرار دہد۔ بدحالے ست (۳۹) کہ بریں گروہ، یعنی حکما (۵۰) گمانِ مصادقت مکنید و جملہ [را (۵۱)] از خود متوحش و از قلتبانِ خود بیم ناک انگارید۔ اگر عزمِ رسیدنِ ایں دیار دارید، خوش باشید (۵۲) ہرگاہ کہ خواہید آمد، بہ چشمِ خود (۵۳) خواہید دید (۵۴)۔

از حالِ مخدومی نواب مہدی علی خاں خبرم نیست۔ من ازیں (۵۵) سراسیمگی (۵۶) کہ از یمین و یسار در شکنجۂ بیم و خطرم کشیدہ اند، مجالِ نامہ نگاری نیافتہ ام۔ نواب صاحب (۵۷) را کجا دماغِ یاد آوریِ خاکساراں است۔

اسد اللہ، فقط۔

[ربیع الثانی ۱۲۳۶ھ مطابقِ ستمبر، اکتوبر ۱۸۳۰ء]

(۲۴/۳۲)

دل بہ درد آمدگاں را از نالہ و فریاد منع نتواں کرد و ماتم زدگاں را از سینہ کوبی باز نتواں داشت۔ مرا کہ دل از بے مہریِ شما بہ درد آمدہ است، از نالہ و فریاد چارہ نیست۔ و چوں بہ دردِ تغافل جاں دادہ، در ماتمِ وفا نشستہ ام، سینہ خواہم کوفت، اگرچہ سنگِ خارہ نیست۔ ستم کہ چوں دو ہفتہ گزشتے و کتابتے از جانبِ شما و مولوی سراج الدین احمد نرسیدے، جگر را (۵۸) بہ

وندان گرفتے و از خود رفتے۔ ہماں شمائید و ہماں مولوی سراج الدین احمد (۵۹) و ہماں ایں دردمندِ اندوہ گیں۔ شش ماہ است کہ (۶۰) بر حاشیہ مکتوبِ دیگران (۶۱) ہم (۶۲) بہ سلام (۶۳) یاد نہ کردہ اید، تا بہ نامہ و پیام چہ رسد۔ نارسیدنِ نامہ از جانبِ من نہ از آنست (۶۴) کہ در ترکِ وداد پیرو شما بودہ باشم، و نہ از آں روست کہ من آں قدر در غم و اندوہ فرو رفتہ باشم کہ یارائے نفس کشیدن و حرف زدن نداشتہ باشم۔ سپاس گزارِ خدائے داد گرم کہ با ایں (۶۵) تنِ لاغر دلم را فربہی و تنومندی بخشیدہ است کہ اگر فی المثل دو عالم برہم خورد، از حالِ خویش بر نگردم، و با ایں (۶۶) ہمہ در وفاداری آں مایہ ثابت قدمم کہ [اگر (۶۷)] سر برود، پایم از خطِ جادۂ مؤدّت نہ لغزد۔ بارے خدارا بگوئید کہ شمارا چہ در دل گزشت و مولوی سراج الدین را چہ پیش آمد؟ مگر دانستہ بودند کہ رجوعِ اسد اللہ با من معلولِ آنست کہ [من (۶۸)] از اعیانِ دفترِ کونسلم، یعنی (۶۹) از روزے کہ زینت بخشِ پیشگاہِ صدرِ عدالت شدہ اند، گاہے نہ شدہ کہ مرا بیاد آرند (۷۰)۔ فقط۔

[جمعہ، ۲۵ صفر ۱۲۴۷ھ مطابقِ ۵ اگست ۱۸۳۱ء]

[۲] بنام نواب علی اکبر خاں طباطبائی

(۲۵/۸)

سپہر آستانا! منشورِ سرافرازیِ غالب رسید و سوادش توتیائے چشمِ خرد گردید۔ بعدِ دو سہ روز آں چہ بہ خاطر خواہد گزشت، محرمِ رنگ و بوئے اطلاق خواہد گشت۔

امروز جنابِ خدایگانی نواب محمد مہدی علی خاں بہادر رونق (۷۱) افزائے کدورت کدۂ خاکسار اند۔ زہے من و خوشا من! بہ خدمتِ خواجہ صاحبِ مشفق، خواجہ مستقیم صاحب سلام نیاز رسیدہ و بہ پزیرفتن بہرہ ور گردیدہ باد (۷۲)۔

از اسد اللہ

[دورانِ قیامِ کلکتہ]

[۳] بنام سراج الدین احمد

(۳۶/۳۰)

امید گاہا! صحبتِ دریوزہ گردِ ملالے بر ضمیر نیفشاندہ و خارِ (۷۳) غم بہ پیراہن نہ ریختہ کہ مرا دل و دماغِ سخن سازی باشد۔ حاشا، ہر چہ گفتہ ام، از عالمِ خدعہ وریا نہ بودہ و ہر چہ می گویم از بابِ نفاق و مدارا نیست۔ ملخصِ کلام ایں کہ ملازمان راسیلِ آں می بینم کہ غالبِ شوریدہ بال چندِ ویرانۂ شہلۂ بازار نہ باشد و بر سرِ دیوارِ قصرِ جلالِ ما آشیاں بندد و منشاے (۷۴) ایں عنایت جز ایں دو امر نیست: یکے شوقِ مفرط بہ دوامِ صحبتِ من و دیگر گونہ ترحمے بر اندوہِ غربتِ من۔ اگر آنست معاف و اگر اینست انصاف، کہ ہر گاہ باوجودِ ایں بُعدِ مسافت موردِ ایں عتاب و خطابم، در حالتِ قرب چہ گونہ بہ صیانتِ (۷۵) نفسِ خود توانم پرداخت۔ بہ اندیشہ ہاے دور و دراز فرو رفتہ من و ایمانِ من کہ از درازنفسیِ سخہا شکوہ سنج نیم تا از ناانصافیِ تنہا (۷۶) چوں گویم کہ شکایت نہ دارم۔ نخست بہ زباں ہا افتاد کہ فلانے قتیل را ناسزا می گوید، حالے بر من شوریدہ و انجمن با من معارض گردید۔ یکے را بہ روے من آوردند و مرا صیدِ زبونِ وادیِ سخن شمردند۔ چوں دیدند کہ طرفے نہ بستیم و رونقِ بازارِ خویش بہ گزاف نشکستیم، فراہم شدند و فیل و رخ را طرح دادہ، بساطِ شطرنجِ پرخاش را وقفِ رفتارِ پیادہ ساختند و مہرۂ مرا بہ ششدر انداختند۔ منت ایزد را کہ آں چہ من از داورانِ دہر می جویم، مشروط بہ سلیقۂ سخنوری نیست۔ از ایں عربدہ ام چہ باک و از ایں ہنگامہ ام چہ زیاں:

آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

تا چوں پروازِ صعوہا بہ بالِ عقاب است، و روانیِ جوہا بہ پشت گرمیِ محیط، دلم از ایں (۷۷) وادی بر آشفت و خاطرم خیلے غم گیں گردید، جبیں بہ خاکِ عجز سودم، نہ پذیرفتند۔ راہِ پوزش و اعتذار پیمودم، مرحباے نہ گفتند۔ بہ حیرتم کہ بزرگانِ انجمن را کدام خدمتِ شایستہ بجا آرم تا در خورِ تحسین شدہ باشم۔ ایں ہمہ خونابۂ دل است کہ بے خواست از لب و کام می تراود ور نگے از جلوۂ مدعا ندارد۔ آں کہ اکنوں محتاج بہ اظہار آنم، ایں است کہ اختر شناساں را کلیہ ایست کہ می

گویند نظرِ عداوت سعود چنداں ضرر ندارد و نظرِ مودّتِ نحوس نفع نمی رساند۔ بہ عظمت و جلالِ ذاتِ اقدسِ الٰہی کہ شمارا خیلے پاکیزہ گوہر و نیک نہاد یافتہ ام (۷۸) و مرزا افضل بیگ، اگر ازیں نسبتِ اضافی کہ بہ ظاہر دارند، قطعِ نظر فرمایند، پس نظر بہ کریم النفسی و نیک نہادیِ شما و یگانگی و ہمزادیِ مرزا صاحب، عداوتِ شمارا بہتر از مودّتِ بزرگانِ ایں دیار می دانم۔ حال آں کہ عداوت راچہ گنجائی و خصومت راچہ محل۔ زیرا کہ علتے درمیانہ نیست و عداوتِ خود از اعراض است نہ [از] جواہر۔ مگر، ہاں ہاں، ازیں خرابہ برخاستن و بہ سایۂ دیوارِ رافت ملاذاں بسترِ افتادگی بیاراستن احتمالِ رنجشے دارد و بیمِ آزردگی بہ دامنِ اندیشہ می سپارد۔ آزردگیِ شمارا چارہ می توانم کرد و عتابِ شمارا بہ خود گوارا می توانم ساخت، اما بیم آنست کہ اگر بداں طائفہ نزدیک خواہم شد چہ رنج ہا کہ نخواہم کشید و چہ نادیدنی ہا کہ نخواہم دید۔ حقا کہ:

آزارِ دوست خوشتر از مہرِ دشمن است (۷۹)

ہرگاہ ایں کلیہ ثابت شد و ساحتِ ضمیر ہم و گرا از گرد و غبار بیگانگی رُفت و روب یافت، سخن از مدعای سرایم و پردہ از رُوے کار برگشایم کہ اگر ہم خانگیِ من بہ خیالِ دوامِ صحبت است، آں خود صورت نہ خواہد بست۔ چہ پگاہ وقتِ رفتن بہ دفترخانہ و بیگاہ، یعنی آخر روز باز آمدن بہ کاشانہ۔ شب از براے آرامش و استراحت است، نہ از بہرِ حرف و حکایت، و اگر خود ہمہ سعی در غم خواری و دل جوئیِ من است، چشمے بہ حالِ من باید کشود کہ در چہ کارم و چہ در سر دارم۔ ہم چو شبنمے بر سرِ خارِ رہ گزرے و سپندے بہ رُوے پارۂ اخگرے نشستہ ام و نویدِ فرصتے نہ دارم، تا کاتبانِ دفترِ تقدیر بر سرم چہ نوشتہ اند و خامہ را بہ خونِ چہ مایہ آرزوہا سرشتہ۔ گلگشتہ منتہاے سفرِ آوارگیم نیست۔ ندانم کدام کوہ و بیاباں پیمودنی ست و قدم در چہ رہ گزرہا فرسودنی۔ اگر دو سہ ماہ بہ سایۂ دیوارِ شما آسودم، چہ سود!:

مرا بہ بیں کہ چہ روزِ سیاہ در پیش است (۸۰)

بالجملہ رحمتے بہ ازیں نیست کہ مرا در کنجِ ایں خرابہ تنہا واگزارند و بےکسے را بہ غربت جاں دادہ و بہ خاک سپردہ انگارند:

دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

اللہ بس، ماسوا ہوس۔ فقط۔

[صفر تا ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ مطابقِ اگست تا اکتوبر ۱۸۲۸ء]

[۴] بنام خواجہ فیض الدین حیدر شائق جہانگیر نگری

(۱۸/۲۷)

یا ہمہ خرسندی از وے شکوہا دارم ہمی
تا نداند صیدِ پرسش ہائے پنہانی مرا

مہرِ مجسّم و لطفِ مصوّر، سلامت! ایمانا کہ با اشراقِ ضمیر فراز رسیدہ اند کہ قلاقی را شکوہ استعداد فترو فتر است و اندوہ (۸۱) بے مہری داستاں داستاں، لاجرم جاست کہ نامہ فرستادہ اند و نویدِ خوش دلی دادہ۔ ما نیز لب از شکوہ فرو بستہ ایم و زباں بہ ستائشِ مہربانی گشادہ۔ خرسندیِ خاکساران کوے محبت وابستہ بہ سعیِ نسیم قلابیت و شادابیِ وارستگانِ عالمِ الفت بہ بندِ پرسشِ گاہ گاہ ہے۔ مکرمی جناب مولوی سراج الدین احمد صاحب بہ ہم زبانیِ مشفقی آغا محمد حسین فصلے در استعدادِ عدم تودیع از جانبِ جناب تحویلِ سامعہ فرسودہ اند۔ حقِ خدا کہ در نوردِ ہر گونہ گزارشِ دل را بداں ترانہ ہم آواز یافتہ ام، چہ نیک دانستہ (۸۲) ام کہ کتاشے بہ عہد رُو نمودہ و صداع مانعِ وداع بود، بل کہ دریں داوری معارض با خویشتنم کہ چرا فرصت از کف دادم و وقتِ وداع در نیافتم۔ کاش، دوستے در جہانگیر نگر داشتے تا وکیلِ بے زبانی ہائے من گردیدے و از جانبِ من بساطِ پوزش گستردے۔ چہ خوش باشد کہ رحم بر بے کسی ہائے من فرمایند و ہم خود از جانبِ من معذرت خواہِ خویشتن باشند۔ والسلام والاکرام۔ فقط محمد اسد اللہ ۲ از رمضان (۸۳)۔

[۲ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابقِ ۸ مارچ ۱۸۲۹ء]

(۳۱/۳۸)

خاکسار نوازا! گوہرِ ایں نامہ پیرایۂ ورود یافت و سلامتِ حالِ سامی نیایش گر و سپاس گزار ایزدی ساخت۔ نالۂ سپند و بے قراریِ سپند از اجلّۂ بدیہات ست و انکار در بدیہات گنجائی ندارد۔ ہر کرا بے قراریِ سپند باور نیست، گو بیا و مشتے سپند بہ روے (۸۴) آتش ریز تا بنگری (۸۵) چہ گونہ می جہد۔ آرے، بے قراریِ سپند مثلِ بے قراریِ سیماب بالذات نیست و معلولِ اثرِ حرارتِ نار است۔ ہرگاہ قائل در مصرعۂ نخستیں اشارے بہ جانبِ نار کردہ باشد چناں کہ گوید:

تا دیدم روے آتشینش

بے تامل مصرعِ ثانی درست و جائز و روا خواہد بود:

مانندِ سپند بیقرارم

ہا، آں دو مصرعِ دیگر را باز گویم:

مانندِ سپند بے شرارم

سپند را اگر صورتے پیدا شود و بر شرار حالی از تکلف نیست و اگر "بے شرار" گویند، خلافِ واقع خواہد بود، زیرا کہ سپند بہ مجردِ احساسِ اثرِ حرارتے از اخگر بر می جہد و خود را می بازد۔ آں مایۂ تمکیں از کجا آرد کہ طرفِ شرار گردد۔ ہا:

مثلِ سیماب بے قرارم

مصرع در نفسِ خویش بے عیب است، لیکن بہ مصرعِ اول ربط نہ دارد، زیرا کہ سیماب بے وجودِ آتش نیز بے تاب است، و ایں مصرع:

تا دیدم روے آتشینش

در مقابل چیزے می خواہد کہ (۸۶) او را بہ مجردِ قربِ نار حالتے روے دہد کہ پیش از قربِ نار نداشتہ باشد۔ ہر آئینہ دریں صورت مشبہ بہ جز سپند و پروانہ و باروت و خار و خس و امثال و نظائر اینہا تجویز نتواں کرد و اگر گویند کہ سیماب نیز در قربِ نار حالتے تازہ بہم رساند، گویم مسلّم، اما

وجہِ تشبیہ بے قراری ست، و آں در سیماب دائمی ست بایں حال- اگر مصرعِ اولیٰ ایں ست:

دیدم تا رُوے آتشینش

مصرعِ ثانی بہ قیدِ قافیہ "بے قرار"، گرم ازیں نخواہد بود:

مانندِ سپند بے قرارم

فقط-

مطلعِ غزلِ جناب:

مسیحِ زمانست و جانِ منست ایں
جہانا کہ روح و روانِ منست ایں

بسیار نغز و بے عیب، لا اگر بجاے "زماں" لفظِ "جہاں" آرند لطیف تر از اول ست، چہ لفظِ "جہاں" با لفظِ "جاں" ملائم و مناسب تر از لفظ "زماں" است، فتأمّل-

ہمیں خوں بہا بس بود بعدِ قتلم
چہ گوئی کہ از کشتگانِ منست ایں

ایں بیت بسیار بامزہ و مربوط، لا "چہ گوئی" لفظِ سامعہ آزار ست و معنیِ دور از کار می دہد- چرا بے تکلف نہ می فرمایند:

بفرما کہ از کشتگانِ منست ایں

نہ پرسید گاہے زحالِ دروغم
وفاے بتِ بدگمانِ منست ایں

اگر (۸۷) از عالمِ الفاظ قدم فکر فرا تر نہادہ پارۂ بحالِ معنیٰ نگریستند، ایں بیت در رتبہ پہلو بہ ابیاتِ نازک خیالانِ گزشتہ می زد و ما آں را بہ عبارتے صاف عرض می کنیم-

مشفقا! حاصلِ معنی جز ایں نیست کہ یار بے وفاست و گاہے حالِ مرا نہ می پرسد، بس لفظِ "بدگماں"، کہ صفتِ "بت" واقع شدہ، از عالمِ حشوِ قبیح خواہد بود، زیرا کہ ہرگز دخل در معنیٰ ندارد- چرا نہ می گویند:

اداے بتِ بدگمانِ منست ایں

حاصلِ سخن این که بیتِ من بدگمانست و می داند که من عاشقِ صادق نیستم و خود را بہ مکر و تکلف رنجیده می نمایم، لهذا حالِ درد و غم نه می پرسد و این ناپرسیدن ادائے بدگمانیِ اوست۔ حق خدا که این بیت در ته داری و استواری عالمے دارد که صاحب طبعِ سلیم آں را داند۔ چهار شعرِ دیگر بیچ مطلع، اگر راست گویم، هرگز نگاه نتواں داشت و ستم بر کاغذ نتواں کرد۔ بہ ازیں چوبند و دیگر فرمایند:

هر چه ازاں نام و نشانش دهند

چوں نه پسندد، به ازانش دهند

والسلام والاکرام۔ راقم اسد اللہ

محررۂ ششم صفر، روزِ آدینه، بعدِ ورودِ والانامه به دو ساعت۔ فقط۔

[جمعہ ٦ صفر ١٢٣٥ھ، مطابقِ ٧ اگست ١٨٣٩ء]

[٥] بنام خواجه محمد حسن صاحب

(١٣/٢٩)

جنابِ عالی! چوں امروز در بندِ فراہم آوردنِ فرمایشِ طفلاں مانده ام، اگر به خدمت نه رسیدم هم از حاضرانم۔ امید که اجزائے خطابیِ نواب سید عالم علی خاں صاحب رقم کنید و به من فرستید۔ به شرطِ بقائے حیات فردا هنگامِ نیم روز به خدمت می رسم۔ زیاده نیاز۔

اسد اللہ

[عشرۂ اولیٰ ماهِ رمضان ١٢٣٨ھ، مطابقِ ٢٢ تا ٣١ جنوری ١٨٣٣ء]

(١٣/٣٠)

قبلۂ حاجات! چوں رفتنِ جناب به راهِ گڑگانوا (کذا) اتفاق نیفتاد و دانستم که جناب را اشتیاقِ دیوانِ فقیر بیش از بیش است، ناچار التجا به نواب صاحب قبله و کعبه مبارزالدوله نواب

حسام الدین حیدر خاں بہادر کردم و دیوانے کہ جنابِ ممدوح برائے خود بہ شوقِ تمام نوِسانیدہ بودند، بہ گدائی طلبیدم۔ ایزد تعالیٰ نواب صاحب را سلامت دارد کہ بطلانِ ذوقِ خود روا داشتہ، آں اجزا بہ من بخشیدند، چناں کہ آں اجزا بہ خدمت فرستادہ می شود۔ بہ احتیاط نگاہ باید داشت و بہ حیدر آباد رسیدہ جلد ایں اجزا مرتب باید ساخت۔ زیادہ نیاز۔

اسداللہ

[عشرۂ اولیِ ماہِ رمضان ۱۲۴۸ھ مطابقِ ۲۲ تا ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء]

(۳۱/۱۵)

خواجۂ جمیل المناقب، رفیع الشان، مخدوم و مطاعِ بندہ جناب خواجہ محمد حسن صاحب زاد مجدہٗ، قبلۂ من! ہر چند مطلبے کہ زبانِ گوہر فشاں بہ گوشم رسیدہ است، بداں نیرزد کہ نامہ را بداں تواں آراست و سخن را در شرحِ آں دراز تواں کرد و عبارت رنگیں کردن و مزہ بے مزہ استعارات در عبارت صَرف ساختن از مطلب باز ماندن و مکتوب الیہ را در پیچ و تاب انداختن است، لیکن اگر فرماں بجا نیارم، خاطر ملول گردد۔ بہ ہر حال سطرے چند سادہ و ہموار رقم می گردد۔ و ھو ھٰذا:

> پیش ازیں دو قطعہ عرض داشت از لکنو (کذا) یکے بہ فورِ ورود در آں دیار و یکے حینِ روانگی از آں معمورہ بہ حضورِ مکرمت ظہور ارسال یافتہ۔ اغلب کہ بہ نظرِ ربوبیت اثر گزشتہ، شارحِ کوائفِ مندرجہ گشتہ باشد۔ بالجملہ عبودیت کیش بہ رہ نمائیِ اقبالِ خدایگانی بہ استقبالِ دولت ہائے مستقبلہ بہ دار الخلافت شاہجہان آباد رسیدہ و از رنجِ سفرِ ڈاک آرمیدہ در صددِ آنست کہ ساز و برگِ سفر ترتیب دادہ رہ گرائے منزلِ مقصود گردد و از عالم نیکو بندگی و ہوا(۸۸) خواہی آں چہ مکنونِ ضمیر فدویت تخمیر است، بہ ظہور آرد۔ باقی حالاتِ ضروری العرض بہ اظہار برادر صاحب قبلہ خواجہ فخراللہ صاحب عالی رائے عالم آرائے خواہد گردید۔ زیادہ حدِ ادب۔

نیرِ دولت و اقبال از مشرقِ جاہ و جلال بہ فروغِ جاوید تابندہ و درخشندہ باد۔ فقط۔

اسد اللہ کمزر عرض می کند کہ مطلب مختصر است و حرفِ مختصر را طول بے جا دادن از عیوبِ عبارت ست لا در افزائشِ القاب براور صاحب خود اختیار دارند۔ اگر یک دو لفظ بیفزایند، زیاں ندارد۔ والسلام والاکرام۔

[عشرۂ اوّلِ ماہِ رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۲۲ تا ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء]

[۶] بنام خواجہ فخر اللہ صاحب

(۳۲/۱۶)

یا اسد اللہ الغالب۔ بہ والا خدمتِ رفعات درجت، خواجہ صاحبِ جمیل المناقب، عظیم الشان، مخدوم و مطاعِ نیازمنداں، جناب خواجہ فخر اللہ صاحب زاد مجدہٗ و علاوہ منظور و مقبول باد۔

قبلۂ حاجات! در آغازِ نامہ دوست را بہ گراں مایگی ستودن یاد خواں و افسانہ گوے بودن است، ایں زمزمہ بہ سخن سازاں مبارک و در نوردِ نگارش سرگزشت حرفِ شوق بشستن نقاب بہ رُوے شاہدِ راز فرو بستن است، ایں شیوہ بہ پردہ طرازاں ارزانی۔ گزیں روشے کہ نامہ نگاری را شاید، آنست کہ بشستن از گفتن آں مایہ دور تر زود کہ سرِ ایں ہر دو رشتہ باہم وگر نتواں تافت و نقشِ یکے در آئینۂ دیگرے نتواں یافت۔ بالجملہ بہ جرمِ ایں کہ دیدہ را آئینہ دارِ جلوۂ شاہدِ مدعا خواستے، چہ روز ہاے سیاہ کہ ندید ستم و (بہ) باد آفرہ (۸۹) ایں کہ پنجہ را شانۂ زلفِ لیلاے مراد نقش بستے (۹۰)۔ چہ بلاہا کہ از دہر نکشید ستم۔ از بیدادِ سطوتِ عدو نالاں و سینہ بردمِ تیغِ ملال بہ گلگشتہ رفتن و عمرے دراز دراں جنوکدہ فراخ در کشاکشِ بیم و امید دل تنگ زیستن وانگاہ چوں دعاے نامستجاب بر گردیدن و چوں بلاے ناخواندہ و باے ناگہاں بہ وطن رسیدن و آمیزشِ حکامِ ستم پیشہ با دشمن و گم گشتنِ سررشتہ کار از دست و رسیدنِ آبگینۂ تدبیر بر

سنگ و فرو رفتنِ بیناریزہ [ہا(۹۱)] در پاے و مُردنِ ستر اندرو استر لنگ بہ مرگِ ناگہاں در آغازِ داوری و رفتنِ مولوی محمد محسن از میانہ در ہنگامِ پایانِ تظلّم و عارض گشتنِ ایں چنیں اعراضِ ردیہ بر جوہرِ صنعتِ حال و آبی گشتنِ کارہا در کشا کشِ امواجِ طوفاں۔ ایں گونہ حوادث اگر خواہے کہ براستیفا بر گزارے و سراسر عرضہ دارے، بہ صد صفحہ کراں نپزیرد، و بہ ہزار نامہ انجام گراے نگردد۔ قدومی خواجہ محمد حسن صاحب تیرگیِ روزِ سیاہ نامہ نگار دیدہ اند و غربتِ من در وطن تماشا کردہ اند۔ دل از آمیزشِ بے وفایانِ فرنگ بہم بر آمدہ و رواں از اختلاطِ ایں تازی درونانِ شیدرنگ آزردہ۔ حالیا بر آں سرم کہ اگر کسے از جاہ منداںِ ہندوستان بہ من پردازد و بہ ہنجارِ اندازہ نگاہ داری و قانونِ پایہ شناسی مرا بہ سوے خود خواند، دل بہ پیچاکِ طرّۂ دل آویزِ گردِ رہش بندمے و رختِ سفر بہ سایۂ دیوارِ قصرِ والایش کشایمے، ورنہ قلندرانہ از سرِ ایں تیرہ خاکداں برخیزمے و گردِ جہاں گردمے و سراسرِ آفاق پیمایمے۔ دل بہ طوفِ آتش کدہاے یزد می کشد و دیدہ تماشاے مے خانہ ہاے شیراز می جوید۔ چناں کہ شوقم دریں پردہ بدیں آہنگِ فراواں زمزمہ ہا دارد۔

غالب از ہندوستاں بگریز، فرصت مفتِ تست
در نجف مُردن خوش است و در صفاہاں زیستن

سطرے چند بہ صنعتِ تعطیل از رگِ کلک فرو تراویدہ، و دل از ہوس ناکی شہیدِ جلوۂ ایں آرزو گردیدہ است کہ عنوانِ ایں ورق بہ لمعۂ نگاہِ معلّی القاب، سیّدِ عالم و قبلۂ اہلِ عالم خاورستاں گردد! اگر از کرنکِ مدِّ طولِ زمانِ فراق حرفِ وفا از صفحۂ خاطر نستردہ، و صرصرِ استغنا خاکساری ہاے غالبِ مُستہام از یاد نبردہ باشد، ہمت دریغ نباید داشت۔ والسلام والاکرام۔

از اسد اللہ

نگاشتۂ دہم رمضان ۱۲۴۸ھ

[۱۰ رمضان ۱۲۴۸ھ، مطابق ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء]

☆ ☆ ☆

حواشیِ "مآثرِ غالب"

از

قاضی عبدالودود

☆

"مآثرِ غالب" دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں اردو فارسی کی وہ نظم و نثر ہے جو مختلف ماخذوں سے حاصل کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں صرف وہ فارسی خطوط ہیں جو حکیم حبیب الرحمان مرحوم کے کتب خانے کے ایک مجموعے سے لیے گئے ہیں۔

حواشی میں رموزِ ذیل مستعمل ہوئے ہیں:

"اردو" = "اردوے معلیٰ"، مطبع کریمی، طبعِ اول [ستمبر ۱۹۲۲ء]

"المعجم" = "المعجم فی معائیر اشعار العجم" (گب)

"برہان" = "برہانِ قاطع" از برہان، پیشِ نظر نسخہ طبعِ ۱۲۷۴ھ

"پنج" = "پنج آہنگ"، "کلیاتِ نثر" طبعِ اول [جنوری ۱۹۶۸ء] میں شامل ہے۔

"تبصرہ" = "تبصرۂ فرہنگِ غالب"، غالب نمبر "علی گڑھ میگزین" میں چھپ رہا ہے [۱۹۴۸-۴۹ء]

"تذکرۂ نساخ" = فارسی گویوں کا تذکرہ، جس کا چھاپا ۱۳۰۶ھ میں نساخ کی وفات کی وجہ سے ناتمام رہ گیا۔ اس کا خلاصہ میرے پاس ہے، لیکن شائق کا ترجمہ "جادو" ڈھاکا سے نقل ہوا ہے۔

"تیغ" = "تیغِ تیز"

"خطوط" = "خطوطِ غالب"

"درفش" = قاطع کی اشاعتِ ثانی۔ اگر کوئی امر مانع نہیں تو حوالہ اس کے صفحات کا دیا گیا ہے۔

"دل گشا" = "نسخۂ دل گشا"، مطبوعہ: ۱۸۵۳ء، چھاپا ناتمام رہ گیا۔

"راست" = "غالب کی راست گفتاری"، "علی گڑھ میگزین" ۱۹۴۸ء [۴۸-۱۹۴۷ء]، مرتبہ: مختار الدین آرزو

"ساطع" = "ساطعِ برہان"

"سبد" = "سبد چین"، اشاعتِ جناب مالک رام

سراج = سراج الدین احمد

"سخن" = "سخنِ شعرا" از نساخ، ۱۲۸۸ھ کے لگ بھگ تمام ہوا

سعادت = میر سعادت علی

"شت" = "شت بر مرزد ثم عبد الصمد" پر راقم کا مقالہ غالب نمبر "علی گڑھ میگزین"

"شمع" = "شمعِ انجمن" از صدیق حسن خاں، طبع ۱۲۹۳ھ

"شمشیر" = "شمشیرِ تیز تر"

"صبح" = "صبحِ گلشن" منسوب بہ علی حسن خاں، طبع ۱۲۹۵ھ

"عود" = "عودِ ہندی" طبعِ انوارِ احمدی

"غالب" = "غالب" از جنابِ مہر، اشاعتِ ثانی

غلام نجف = حکیم غلام نجف خاں

"قاطع" = "قاطعِ برہان"

"قق" = "قاطع القاطع"

"ک" = "کلیاتِ نظمِ فارسیِ غالب"، طبع ۱۹۰۰ء

"ک م" = شمار ۴۴۱م

"ک م ا" = مکتوبہ ۱۲۵۷ھ۔ غالب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ فہرستِ صحش میں اس کا ذکر نہیں۔

"گلستان" = "گلستانِ سخن" [مرزا قادر بخش] صابر کی طرف منسوب، لیکن اس کی تصنیف میں صہبائی کا بڑا حصہ ہے

"لطائف" = "لطائفِ غیبی"

"م" = کتب خانۂ مشرقیہ، بانکی پور

"متفرقات" = "متفرقاتِ غالب" [طبعِ اول]

"محرق" = "محرقِ قاطعِ برہان"

["محقق" = "غالب بحیثیتِ محقق" از قاضی عبدالودود، مشمولۂ "نقدِ غالب"، مرتبہ مختارالدین احمد آرزو، انجمنِ ترقیِ اردو (ہند)، علی گڑھ، جون ۱۹۵۶ء]

"مؤید" = "مؤیدِ برہان"

"ن" = حکیم حبیب الرحمان مرحوم کے کتب خانے کا مجموعہ، جس سے "تاثر" میں فارسی خطوط لیے گئے ہیں۔

"ن ا" = "ن" کی نقل جو راقم کے پاس ہے۔

نجف = نجف علی خاں

"نول" = مطبعِ نول کشور کان پور، یا لکھنؤ

"یادگار" = "یادگارِ غالب"، انوار المطابع، لکھنؤ

حصۂ اوّل

۱

حواشیِ نثرِ اُردو

[۱] "لطائفِ غیبی" جس کا سالِ الطباع ۱۲۸۱ھ ہے(۱)، سیاں داد خاں سیاح کی طرف منسوب ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا لفظ لفظ غالب کے قلم سے نکلا ہے۔ طرزِ تحریر کی شہادت سے قطعِ نظر، اس میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو غالب کے سوا اور کوئی نہیں لکھ سکتا تھا(۲)، مثلاً عبدالصمد سے متعلق وہ نئی باتیں جو "شت" میں نقل کی گئی ہیں۔ لطیفہ ۸ کی یہ عبارت بھی قابلِ توجہ ہے:

[صاحبو!] خانِ غالب یہاں کیا کرے، مگر [یہ کہ] تم سے داد چاہے۔

یہ غالب خود داد خواہی کر رہے ہیں۔ دیباچے میں جو حافظ کا شعر "درپسِ(۳) آئنہ الخ" مرقوم ہے، وہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ سیاح کا صرف نام ہی نام ہے، اصل مصنف غالب ہیں۔ ان کے نام کے ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اشرف الاخبار" میں قتیل پر اعتراض ان کی طرف سے چھاپ دیا گیا تھا اور یہ کافی سمجھا گیا تھا کہ اشاعت کے بعد انھیں اطلاع دی جائے(۴)، ("اردو"، ص ۱۳)۔ سیاح کو اس میں مضائقہ نہ ہوا تو "لطائف" کو اپنی طرف منسوب کرانے میں کیا تامّل ہوتا۔ اسے اپنے نام سے نہ شائع کرانے میں کئی مصلحتیں تھیں۔ اوّل تو یہ کہ "لطائف" "محرق" کے رد میں ہے اور اس کے مصنف کو غالب قابلِ

خطاب نہ سمجھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ سیاح دہلی کے لیے اجنبی تھے۔ ان کی طرف سے مصنفِ "محرق" کو گالیاں دینے میں آسانی تھی۔ تیسری یہ کہ اس صورت میں خودستائی کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔ "لطائف" کی تصنیف میں غالب نے نیّر سے مدد لی تھی اور علائی سے اعانت کی استدعا کی تھی(۵)، ("خطوط"، ۳۵۸) جو غالباً ملی ہوگی۔ غالب پہلے قدر بلگرامی سے "محرق" کا رد لکھوانا چاہتے تھے(۶) ("خطوط"، ص۱۹۶) مگر کسی وجہ سے اس کی کوئی صورت نہ نکلی۔

سیاح غالب کے شاگرد تھے اور صوبۂ بمبئی کے بعض روسا اور غالب کے درمیان متوسط۔ ان کی ایک کتاب "سیرِ سیاح" ہے، ممکن ہے کہ اس سے ان کے اور غالب کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہو(۷)، لیکن حواشی کی تحریر کے وقت دست یاب نہ ہو سکی۔ "خم خانۂ جاوید" میں ہے کہ سیاح نے ۷۰ برس کی عمر پا کر ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا(۸)، (جلد ۴، ص۳۰۱)۔ صاحبِ "خم خانۂ جاوید" کا یہ بیان کہ ان کے نام کے خط "عود" میں ہیں، صحیح نہیں۔ "اردو" میں البتہ ۳۳ خط ہیں۔ سیاح نے "درفش" کے انطباع کا قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔ "یوں کیا سیاح نے اظہارِ سنِ عیسوی" تشدیدِ نون سے ان کی علمی صلاحیت کا پتا چل سکتا ہے۔ "لطائف" کا قلمی نسخہ، جو میرے پاس ہے، جناب سیّد وزیر الحسن عابدی کا عطیہ اور مطبوعہ نسخوں(۹) کی نقل ہے۔

[۲] "تیغِ تیز" کا سالِ تصنیف ۱۸۶۷ء ہے(۱۰) اور یہ "مؤید" کا جواب ہے، مگر احمد کے محض چند اعتراضات سے بحث کی ہے اور وہ بھی تشفی بخش نہیں۔ مزید یہ کہ کتاب میں متعدد مقامات پر صریحاً خلافِ واقعہ باتیں لکھی ہیں (تفاصیل: "راست")۔ "مؤید" کا سالِ طبع ۱۲۸۲ھ ہے(۱۱) اور "قتی" ۱۲۸۳ھ میں چھپی(۱۲) ہے۔ غالب نے احمد کو "رابعہم"* جو کہا ہے، یہ صحیح نہیں۔ ظاہرا یہ کتاب اشاعت کے بہت بعد غالب کی نظر سے گزری اور وہ اسی بنا پر اسے "قتی" سے مؤخر سمجھے(۱۳)۔ غالب نے کسی دوست سے اس کے بارے میں

---

* سورۂ کہف میں ہے: رابعہم کلبہم۔ خاقانی کہتا ہے: سفلگی رابعہم کلبہم است۔ "رابعاً" کی جگہ "رابعہم" غالباً اسی کو ذہن میں رکھ کر کہا گیا ہے۔

کچھ سن کر ("اردو"، ص ۳۳) اس کے مطالعے سے پہلے اپنا وہ مشہور قطعہ لکھا تھا، جس کی ردیف "کروہ است" ہے(۱۴)، (تفاصیل: "غالب"، ص ۳۴۷)، مگر غالب کا یہ قول کہ احمد قتیل کے بڑے معتقد ہیں، "مؤید" سے ثابت نہیں۔ غالب کا ارادہ تھا کہ "مؤید" کا جواب ڈکا سے لکھوائیں(۱۵)، مگر کسی وجہ سے اس کی کوئی صورت نہ نکلی ("اردو"، ص ۳۷۷)۔ "مؤید" کے لہجے کے متعلق غالب کی شکایات بجا ہیں۔ "برہان" کو غالب نے کچھ ہی کیوں نہ کہا ہو، غالب کے ہم عصروں کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دیں۔ "مؤید" بہترین کتاب ہے جو "قاطع" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اگر اس کا لہجہ معتدل ہوتا اور جا بجا طول بے جا سے کام نہ لیا جاتا تو اور بہتر ہوتی۔ احمد نے "تیغ" کے جواب میں "شمشیر تیز تر" تحریر کی، مگر اس کا چھاپا غالب کی وفات کے بعد تمام ہوا(۱۶)۔ اس کا لہجہ "مؤید" سے بہتر ہے اپنی کتاب "ہفت آسمان" (۱۷) میں(۱۸) انھوں نے غالب کے متعلق یہ رائے دی ہے:

> قوتِ طبع و قدرتِ سخن گزاری نظماً و نثراً او را مسلم است، بل کہ بیشتر نثر او دل رُباتر۔

احمد نے اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور متعدد کتابوں کی تصحیح کی ہے(۱۹)۔ نساخ نے ان کا ترجمہ یوں سپردِ قلم کیا ہے:

> احمد تخلص، آغا احمد علی مرحوم، مدرسِ فارسی بہرۂ مدرسۂ عالیہ کلکتہ، خلفِ آغا شجاعت علی باشندۂ ڈھاکا، ابنِ آغا عبد العلی خوش نویس کہ از دستِ عزیزانِ خود در ڈھاکا مقتول شدہ بود، شاگردِ ... ضیغم۔ زبانِ فارسی را نیکو می دانست۔ در علم عروض و قوافی دست گاہے معقول داشت۔ احیاناً شعر می گفت۔ چند شعرِ فارسی و اردو از نظرم نیز گزرانیدہ بود۔ در عینِ شباب در... سنہ یک ہزار و دو صد و نود ہجری در کلکتہ وفات یافتہ(۲۰)۔ ("تذکرہ")

نساخ نے "واصلِ حق آغا احمد" سے تاریخ نکالی ہے ("تذکرہ")۔ ۱۲۹۰ھ میں جب عینِ شباب تھا تو ۱۲۴۳ھ میں قتیل کی حمایت میں غالب کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنا، جیسا

کہ "غالب" (ص ۱۲۴) میں مذکور ہے، قطعاً ناممکن ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ خود نساخ کا سالِ ولادت ۱۲۴۹ھ ہے ("شمع")۔

مرزا رحیم بیگ رحیم کے متعلق خود صہبائی نے لکھا ہے کہ صہبائی (۲۱) سے تحصیلِ کتب یا اصلاحِ شعر کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن اپنے بعض رسائل پر اصلاح لی اور اس کے علاوہ مراسلت سے بہت سے فوائدِ علمی حاصل کیے ("گلستاں")۔ رحیم کا قول ہے کہ:

رحیقِ تحقیقِ لغات و کنایات از خمخانۂ فیضِ صہبائی خوردہ ("ساطع")۔

"ساطعِ برہان" کا سالِ طبع ۱۲۸۲ھ ہے (۲۲)۔ رحیم نے سعادت کی طرح محض چند اعتراضات سے بحث نہیں کی، کل یا تقریباً کل اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ اس کا لہجہ عموماً طنزیہ ہے۔ کبھی غالب کو "تیمارِ ساسانِ پنجم" کہتا ہے۔ کبھی یہ کہتا ہے کہ ایسے اعتراض میرا سا کور سواد کرے تو کرے، غالب کے لیے زیبا نہیں، مگر کہیں کہیں مخلصانہ یہ بھی کہتا ہے کہ غالب سے مقابلہ تضیعِ وقت ہے۔ اس شخص نے بصارت سے محرومی کے باوجود کس طرح "قاطع" کا جواب لکھا، حیرت انگیز ہے۔

غالب کا یہ بیان کہ سیاح نے رحیم کے بیش تر جواب (کذا) کو "لطائف" میں رد کر دیا ہے (۲۳) ("اردو" ص ۳۳)، بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ غالب نے "نامۂ غالب" (۲۴) میں محض چند امور سے بحث کی ہے۔ اس سے "ساطع" کا درجہ صحیح متعین نہیں کیا جا سکتا (۲۵)۔ رحیم فارسی اردو دونوں کا شاعر ہے اور اس کا کلام تذکروں میں ملتا ہے۔ تذکروں میں اس کی موت کا ذکر نہیں۔

امین الدین امین دہلوی (۲۶) مصنفِ "قاطع القاطع" علوی (۲۷) کے شاگرد تھے۔ "گلستاں" میں ہے کہ:

علومِ متعارفہ کو نہایت تدقیق کے ساتھ... تحصیل کیا اور پایۂ تحقیق کو عرشِ افتخار تک پہنچایا... اشعار فارسی نہایت متانت سے کہتے ہیں۔ علمِ مجسم... ان کے لب کو کبھی تبسم سے خالی نہیں پایا۔

"قق" کا ذکر "محرق" میں ہے، یہ "سعادت" اور امین کے ذاتی تعلق پر مشعر ہے۔ "تیغ" (ص ۲۵) میں غالب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "مؤید" کے مصارفِ طبع "سعادت"

نے تیار کیے ہوں گے۔ یہ خلاف قیاس ہے، لیکن یہ خوبی ممکن ہے کہ "قتیل" "سعادت" نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہو۔ اس کا لہجہ بہت خراب ہے۔ سخت سست تو کہا ہی ہے، فحش گالیاں بھی دی ہیں (۲۸)۔ میرا گمان ہے کہ امین نے صرف "برہان" نہیں، "سعادت" کا بھی انتقام لیا ہے۔ غالب کو بدزبانی کا پھل اچھا نہیں ملا۔ مفتی سید عباس مرحوم نے انھیں ٹھیک لکھا تھا کہ ظرافت نہ کرنی تھی (۲۹)۔ "تیغ" کے انطباع کے بعد غالب نے امین پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا، جس کی روداد رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکی ہے (۳۰)۔ امین کے جرم میں کچھ شبہ نہ تھا، لیکن کئی مولویوں نے غالب کے خلاف جھوٹی گواہی دی (۳۱)، اور غالب کے وکیل نے بھی کسی صلاحیت کا ثبوت نہ دیا، (۳۲) کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا (۳۳)، ("یادگار"، ص ۵۳)۔ امین نے سب و شتم ہی پر قناعت نہیں کی، اپنے دعووں کی فرضی سندیں بھی بے تکلف پیش کی ہیں۔ جس وقت ان کا ترجمہ تذکرۂ نساخ میں لکھا گیا ہے، ظاہراً زندہ تھے۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" شاید سعدی کے یہاں ملتا ہے لیکن "لباب الالباب"، عوفی، جلد ا، ص ۲۸۷ پر یہ قطعہ موجود ہے۔ نام کی جگہ پر نقطے ہیں (۳۴):

گر (۳۵) بما نیم، باز بردوزیم
دامنے کز فراق چاک شدست
ور نمانیم عذر ما بپذیر
اے بسا آرزو کہ خاک شدست

[۳] استفتا "تیغ" کے آخر میں ہے اور اس کا عنوان "اللہ اکبر" ہے۔ تقریباً کل سوالوں کے بعد صح (۳۶) اور ہر جواب کے بعد "محمد المدعو بہ مصطفےٰ" مرقوم ہے۔ یہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، شاگرد غالب، ہیں۔ ان کے مؤیدین h(۳۷) میں سے بھی دو، ضیاء الدین احمد خاں نیر اور حالی، غالب سے بھی نسبت رکھتے ہیں۔ سعادت علی خاں مشہور آدمی نہیں (۳۸)۔ "رسالۂ عبدالکریم" کے آخر میں جو استفتا ہے اس کا جواب دینے والوں میں یہ بھی ہیں۔ تعجب ہے کہ غالب کو نہ یہ سوجھا کہ جب میں کل ہندوستانی فارسی دانوں کو، خواہ وہ

شاعر ہوں یا فرہنگ نگار، نامعتبر قرار دے چکا ہوں تو ہندوستانیوں سے فتوا لینے کے کیا معنیٰ؟ اور نہ یہ بات ان کے ذہن میں آئی کہ جو اصحاب خود میری فارسی دانی کے قائل نہیں، وہ میرے معتقدین و تلامذہ کو کیا خاطر میں لاسکتے ہیں (۳۹)۔ تمہید کی عبارت عیوب سے مملو ہے۔ سوالوں کا جواب فارسی دانوں اور شاعروں سے طلب کرنا تھا۔ صاحبانِ قوتِ ناطقہ و قوتِ عاقلہ سے استفتا بے محل ہے۔ غالب نے "احد اللغتین میں سے جو لغت صحیح ہو" لکھا ہے۔ "احد" کی جگہ "اِحدیٰ" چاہیے۔ "اِحدیٰ اللغتین" کے بعد "میں سے" نہیں آسکتا، اس لیے کہ صرف ایک لغت رہ گیا ہے۔ اگر "اِحدیٰ اللغتین" کی جگہ "لغتین" بھی ہو تو بے محل ہوگا۔ اس لیے کہ بعض سوالات کا فنِ لغت سے کوئی سروکار نہیں، مثلاً سوال ۷، اور بعض میں ایک ہی لغت یا کنائے کے متعلق استفسار [ہے، اس لیے] دو میں سے ایک کو صحیح قرار دینے کا سوال نہیں، مثلاً سوال ۶، ۱۶۔ "غلط ساز" سہو کاتب ہے، "عیب ساز" (۴۰) چاہیے۔ سوالات ان امور سے متعلق بھی ہیں جو احمد اور غالب کے درمیان مابہ النزاع نہیں۔ "تیغ" "مؤید" کا جواب ہے، اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

سوال ۱: اس سوال میں بڑا فریب پنہاں ہے۔ فردوسی اور خاقانی شاعر ہیں، مگر انھوں نے قطران (۴۱) و اسدی (۴۲) کی طرح نثر میں اور شمس فخری (۴۳) کی طرح نظم میں فرہنگ نہیں لکھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ضرورت سمجھ کر فردوسی نے بعض نامانوس الفاظ کے معانی بتادیے ہیں (مثلاً "بیوز")۔ شاعر کو الفاظ کے استعمال کا خاص سلیقہ ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی زبان دانی اس قسم کی ہو جیسی فرہنگ نگاروں کی ہوتی ہے۔

قطران * فحولِ شعرا میں ہے، مگر اس کی فارسی دانی کی نسبت ناصر خسرو کی یہ رائے ہے:

زبانِ فارسی نیکو نمی دانست ... دیوان منجیک و (دیوانِ) دقیقی ... پیش من بخواند و ہر معنی کہ او را (۴۴) مشکل بود، از من پرسید۔ (سفرنامہ)

خسرو بلند پایہ شاعر ہیں، لیکن "اصطرلاب" کا اشتقاق جو انھوں نے بتایا ہے، کون

---

* قطران، وہ فارسی جس میں منجیک اور دقیقی کا کلام ہے، زیادہ نہ جانتا ہوگا۔

تسلیم کر سکتا ہے؟ شعرا کے کلام کا مطالعہ فرہنگوں سے بے نیاز نہیں کر سکتا، بلکہ قدیم شعرا کے کلام کا مفہوم فرہنگوں کی طرف رجوع کیے بغیر اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قیاس سے ہر جگہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ فرہنگ نگار کے مستند ہونے کا دارومدار اس کے وطن پر نہیں، اس کی تحقیقات پر ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ کسی خاص مسئلے کی تحقیق ہندوستانی ایرانیوں سے بہتر کریں۔ ایرانی خود ہندوستانی فرہنگ نگاروں کی سندیں بے تکلف پیش کرتے ہیں۔ لغات کے معانی درکنار، اشعار سے لغات کی حرکات و سکنات کا بھی مکمل علم بہت کم ہوتا ہے۔ بڑے لفظوں کو جانے دیجیے، دو حرفی دُر=مروارید، اور دَر=باب کو لیجیے۔ اگر یہ بطورِ قافیہ نظم نہیں ہوئے تو زیادہ سے زیادہ جو علم ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ "رے" ساکن ہے او "دال" متحرک (۳۵)۔ "دال" کی حرکت کیا ہے، اس کا پتا مطلقاً نہیں چل سکتا۔ بطورِ قافیہ آئیں اور حروفِ وصل سے مل کر "رے" متحرک ہو جائے تو اس صورت میں بھی "دال" کی حرکت کا علم نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ قافیے میں شامل نہیں رہی۔ "دَرش" اور دُرش" بے تکلف ایک دوسرے کا قافیہ ہو سکتے ہیں۔ "رے" متحرک نہ ہو تو اس صورت میں بھی "دال" کی حرکت کا صحیح علم اسی وقت ہو گا جب یہ یقین ہو کہ شاعر اقوا کا مرتکب نہیں ہوا۔ فردوسی کہتا ہے:

بہ زرّین و سیمیں دو صد تیغِ ہند
ہمہ تیغ، زہراب دادہ پرند

(جلد ۱، ص ۵۹)

ز زابلستاں تا بہ دریاے سند
نوشتیم عہدِ ترا بر پرند

(جلد ۱، ص ۱۳۸)

"ہند" کی "ہے" اور "سند" کا "سین"، ہر شخص جانتا ہے کہ مکسور ہے، "پرند" کی "رے" کا مفتوح ہونا بھی مسلّم ہے۔

فردوسی کے اشعار سے ان حروف کی صحیح حرکت کا بھی علم نہیں ہو سکتا۔ حرکات

سکنات پر نہیں موقوف، یہ پتا چلنا بھی مشکل ہے کہ [کوئی لفظ] کن حروف سے مرکب ہے، اس لیے کہ کاتب کی غلطی کا ہمیشہ احتمال ہے۔ بطورِ قافیہ آئے جب بھی صرف ان حروف کا علم ہوگا جو قافیے میں بہ تکرار آتے ہیں اور وہ بھی(۴۶) اس صورت میں کہ شعرا کفا سے بری ہو۔ فردوسی کے(۴۷) شعرِ ذیل میں ایک ردیف جیمِ عربی اور دوسرا جیمِ فارسی ہے:

بخارا و سُغد و سمرقند و چاچ
سپیجاپ(۴۸) و آں کشور و تختِ عاج

(جلد ۱، ص۴۲۹)

عروض کے قواعد کے مطابق جو اشعار کی تقطیع ہوتی ہے، اس میں بعض صورتوں میں حرکت سکون سے اور سکون حرکت سے بدل جاتا ہے۔ ایک بیت یا ایک نظم میں مختلف زحافات استعمال ہو سکتے ہیں، یہ بھی دقتیں پیدا کرتا ہے۔ عروض و قافیہ در کنار، شاعر الفاظ میں جو تصرف کرتے ہیں، اور جس کا بقولِ غالب انھیں اختیار ہے(۴۹)، اس کی وجہ سے بھی لغت کی اصلی ہیئت اور اس کے اصلی معنیٰ کا شعرا کے کلام سے معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ طغرا نے، بقولِ غالب، "دریچہ" (بہ یاے معروف) کو "دریچہ" (بہ یاے مفتوح) باندھا ہے(۵۰)، (مجھے اس سے اختلاف ہے۔ تفاصیل کے لیے "تبصرہ"۔) اگر یہ مانوس لفظ نہ ہوتا اور شعر میں مستعمل نہ ہوا ہوتا اور فرہنگ نگاروں کا قول ناقابلِ اعتنا قرار دیا جاتا تو یہ تسلیم کرنا پڑتا کہ "یاے مفتوح" کے ساتھ ہے۔ خاقانی کا مصرع ہے:

ہم عمرِ خیامی و ہم عمرِ خطاب

ظاہر ہے کہ خاقانی، یا اور شعرا، کے بہ تشدید استعمال کرنے سے [عمر کا] میم مشدد نہیں قرار پا سکتا۔

سوال کی عمومی حیثیت کو چھوڑ کر اب یہ دیکھیے کہ غالب نے یہ بحث کیوں چھیڑی۔ غالب نے "قاطع" میں دعوا کیا تھا کہ جو لوگ سعدی کے شعر کی سند پر "گرفت" کی "رے" کو مکسور کہتے ہیں، غلطی پر ہیں۔ فردوسی "شاہ نامہ" میں سو جگہ "گرفت" کو "خفت" و "گفت" کا قافیہ اور ہزار جگہ "شگفت" کا قافیہ لایا ہے لیکن وہ ایک جگہ اسے "رفت" کا قافیہ لایا ہے(۵۱)،

اور خاقانی نے کہا ہے:

خور پیشِ تو رہ پیادہ رفتہ
مہ غاشیۂ تو برگرفتہ

صحیح بھی ہے اور جگہ "کفایۂ حرکتِ ماقبلِ روی" ہے۔ اگر کوئی شخص فتحۂ "را" کی سند میں جو شعر میں نے دیے ہیں، انھیں بھی اس قبیل سے تصور کرے تو اسے تحقیق سے بہرہ نہیں اور میں اس سے گفت گو نہیں کرتا۔ سعدی کا شعر، جس کا ذکر آیا ہے، یہ ہے:

تبسم کناں دست بر لب گرفت
کہ سعدی مدار آنچہ دیدی شگفت

("قاطع، ص ۱۴۸)

یہ تو ظاہر ہے کہ غالب اس سے اختلاف نہیں کرتے کہ "شگفت" کا کاف مکسور ہے، ورنہ وہ یہ ضرور لکھتے کہ سعدی کی سند دینی غلط ہے۔ اس سے "گرفت" کی "را" کا فتحہ ثابت ہوتا ہے۔ اس سے اختلاف نہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ فردوسی نے ہزار بار* جس طرح استعمال کیا ہو، اسے ان شکلوں پر جو اس کے مقابلے میں بہت کم اس کی زبان پر ہیں، کیوں ترجیح نہ دی جائے۔ اور اگر فردوسی ہزار بار ایک طرح اور سو بار ایک طرح "کفایۂ حرکتِ ماقبلِ روی" کا ارتکاب کر چکا ہے تو یہ کیوں ناممکن سمجھا جائے کہ "رفت" اور "گرفت" کے قافیے میں عیب ہے۔ "کفایۂ حرکتِ ماقبلِ روی" کے الفاظ کے استعمال سے یہ ظاہر ہے کہ غالب "ـف" کو روی قرار دیتے ہیں، حالاں کہ روی "ـت" ہے۔ یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ روی قافیے کے آخری حرفِ اصلی یا اس کے قائم مقام کو کہتے ہیں۔ خاقانی کا شعر "رے" کی کسی خاص حرکت کے ثبوت میں وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو فنِ قافیہ سے بالکل ناواقف ہے۔ "گرفتہ" میں "ـت" روی ہے جو حرفِ وصل "ہائے مختفی" سے مل کر متحرک ہو گئی ہے۔ اس صورت میں "رے" کی حرکت قافیے میں شامل نہیں۔ وہ مضموم، مفتوح، مکسور، سب ہو سکتی ہے۔ ان باتوں کو احمد نے "سوئد" (ص ۴۴۴) میں اچھی طرح سمجھا دیا تھا، اور انھوں نے وہی

---

* اس کی حقیقت "غالب بحیثیت محقّق" میں ملاحظہ ہو۔

بات کہی ہے جس پر جمہور کا اتفاق ہے،* لیکن غالب "تیغ" میں پھر بھی بے سُرا راگ گاتے ہیں:

> مولوی... لکھتا ہے، "گرفتن" بکسر تین ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا "رفتن" بھی بہ کسرۂ اول ہے؟ (اس کے بعد فردوسی اور خاقانی کے وہی شعر دیے ہیں جو "قاطع" میں ہیں)... اور جوازِ اختلافِ حرکتِ ماقبلِ روی سے قدما کے دیوان بھرے ہوئے ہیں۔ خصوصاً "قصۂ ویس و رامین" (۵۳) میں فخر گرگانی نے قیدِ حرکاتِ ثلاثہ اٹھادی ہے، گشتہ و کشتہ قافیہ۔ (ص ۱۹)

"گشتہ" و "کشتہ" کے قوافی کو غالب کے سوا کسی نے غلط نہیں کہا (اس سلسلے میں "تیغ" ص ۶، اور "اردو" ص ۷۷-۳ بھی ملاحظہ ہو)۔ غالب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ "گرفت" کی "را" مفتوح ہے۔ سروری کاشانی لکھتا ہے:

> شگفت بہ کسرِ کافِ تازی عجب باشد۔ "بوستاں" (۵۴):
>
> یکے خُردہ بر شاہِ غزنیں گرفت
>
> کہ حسنے ندارد ایاز اے شگفت **
>
> (ص ۱۷۵)

سروری کے نزدیک "گرفت" کی "رے" مکسور نہ ہوتی تو وہ اس شعر کو "شگفت" کے مکسورالکاف ہونے کی سند میں نہ لاتا۔ آخر میں اس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ "بہ فتح و ضمِ کاف نیز آمدہ" لیکن ظاہرا یہ مروجہ زبان سے متعلق نہیں، اس کی بنا وہ اشعار ہیں جن میں "شگفت"

---

* شمس قیس صاحبِ "المعجم"، طوسی، جامی، عطا ءاللہ، سب کا یہی مسلک ہے۔

** "انجمن آرائے ناصری" میں "شگفت" کو مکسورالکاف لکھا ہے اور آخر میں وہی عبارت ہے جو سروری نے فتحہ و ضمّۂ کاف کے بارے میں تحریر کی ہے۔ فتحۂ کاف کی مثال میں سنائی اور ضمّۂ کاف کی مثال میں سعدی کا شعر پیش کیا ہے۔ موخرالذکر میں "شگفتم" "نہفتم" کا قافیہ ہے۔ اس سے ضمّۂ کاف کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ فنِ قافیہ سے "انجمن آرا" کا مصنّف بھی ناواقف معلوم ہوتا ہے۔

ایسے الفاظ کا قافیہ آیا ہے جن میں "ـفـ" سے پہلے کا حرف مفتوح یا مضموم ہے۔ "جہاں گیری" میں صرف مکسورالکاف ہے اور نظامی کا شعر سند میں دیا ہے جس میں "شگفت" کا قافیہ "گرفت" نظم ہوا ہے۔ "فرہنگ نوبہار" جلد ۴ میں، جس کے جامع محمد علی تبریزی خیابانی ہیں، "شگفت (۵۵) = تعجب" بہ کسرِ اول و ثانی مندرج ہے اور "گرفتہ" کا وزن "فرشتہ" بتایا ہے۔ شعرائے ایران کے کلام میں "گرفت" بہ کثرت "شگفت" کا قافیہ آیا ہے۔ میں دو مثالوں پر اکتفا کروں گا:

آخر الامر قاعدے بگرفت
نامۂ نظم داد و نیک شگفت

(انوری، ص ۶۴۷)

تہی دست و بے خیل و مال اے شگفت
نگر تا جہاں را چگونہ گرفت

صاحب مازندرانی: "مجمع الفصحا"، جلد ۲، ص ۳۱۷)

اس کتاب میں اس شاعر کے دو اور شعر ہیں، جن میں یہ قافیے آئے ہیں۔

سوال ۲: "پیدایش" و "زیبایش" کے متعلق غالب صرف یہ کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ ان کا صحیح ہونا نظائر کا حاجت مند نہیں (۵۶)، لیکن چوں کہ قاعدہ ان کا مخالف ہے، ایرانیوں کی لکھی ہوئی فرہنگوں یا ان کے ادب سے ان کے استعمال کی سند پیش کرنی تھی۔ "پیدایش" مخفی کے دیوان (مطبوعہ و مخطوطہ: "م") میں ایک جگہ ملتا ہے، مگر بطور قافیہ نہیں۔ جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ ابوالفضل کے یہاں کئی جگہ آیا ہے۔ آج کل ایرانی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مخفی کے معاصر یا اس سے قبل کے ایرانیوں کے یہاں مجھے یہ لفظ نہیں ملا۔ "زیبایش" اردو میں مستعمل ہے، ایرانیوں کی زبان پر نہیں۔

سوال ۳ (۵۷): احمد نے صائب، زلالی، والہ ہروی، مسیح کاشی وغیرہ کے کلام سے ثابت کیا ہے کہ ایرانی "راند" و "ماند" کی قسم کے لفظوں کو "تند" و "کند" کی قسم کے

لفظوں کا قافیہ لاتے ہیں۔ مسیح کا شعر جو "بہارِ عجم"، جلد ۱ ("نول"، ص ۱۲۱) میں بھی ہے، یہ ہے:

آتش بہ زبانِ شعلہ بر سی زدہ بانگ
کز بہرِ چہ بسانِ خاکستر گنگ

غالب اور ان کے مددگار اپنے دعوے کو ثابت نہ کر سکے۔

سوال ۴: تمہید میں غالب نے اس سوال کا جواب بھی بتا دیا ہے، جو انھیں نہیں چاہیے تھا۔ "چشمِ عیب ساز" احمد کے نہیں "برہان" کے الفاظ ہیں (تفاصیل: "راست")۔ "عیب ساز" میں کوئی خاص قباحت نظر نہیں آتی۔ یہ "عیب بین" کے معنیٰ میں نہیں، "عیب آفریں" کا مرادف ہے۔

سوال ۵: جواب غلط ہے۔ اعتراض کا سرقہ ہو سکتا ہے۔ اگر غالب نے دوسروں کا اعتراض دیکھا تھا اور وہ ازخود ان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا اور انھوں نے اصلی معترض کا ذکر بالارادہ نہیں کیا تو سرقے میں کیا شبہ ہے۔ سامانی کا بیان "آب چیں" سے متعلق، ممکن ہے، غالب کی نظر سے نہ گزرا ہو، لیکن محشیِ "برہان" کے اعتراض، جو انھوں نے اپنی جانب سے پیش کیے ہیں، اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ "برہان" میں ۸۱ حاشیے ہیں اور ان میں سے بیش تر غیرِ عربی الفاظ سے متعلق ہیں، لیکن غالب "قاطع" میں محشی کے ایک اعتراض کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

مہتممانِ کارگاہِ انطباع جابجا حاشیہ ہا نگاشتہ اند، تا ہمہ در اغلاطِ لغاتِ عربی۔

کسی مخالف نے یہ لکھا کہ:

حواشی لغاتِ فارسی سے متعلق بھی ہیں اور غالب کے کچھ اعتراضات حواشی میں بھی ہیں۔

تو "درفش" میں "ہمہ" کو "اکثر" بنا دیا۔ ان کا قول اس ترمیم کے بعد بھی غلط رہا۔ "قاطع"

کے متعدد اعتراضات حواشیِ "برہان" سے ماخوذ تھے اور اس کا اعتراف غالب نے نہیں کیا تھا، بلکہ یہ لکھ کر کہ حواشی کا تعلق صرف لغاتِ عربی سے ہے، کنایتاً اس سے انکار بھی کیا تھا کہ لغاتِ فارسی پر ان کے جو اعتراض ہیں وہ حواشی سے لیے گئے ہیں۔ "درفش" میں غالب نے دوسری روش اختیار کی ہے۔ جابجا فخریہ اس کا ذکر کرتے [ہیں] کہ سات فضلائے کلکتہ جو "برہان" کے محشی ہیں، میرے ہم نوا ہیں (۵۸)۔ غالب کو اس کی بھی خبر نہیں کہ یہ حواشی کے۔ روبک کے لکھے ہوئے ہیں اور مصححینِ مطبعِ طبی، جن میں حکیم عبدالمجید کے سوا کسی کے عالم ہونے کا ثبوت موجود نہیں، ان سے کچھ سروکار نہیں رکھتے (۵۹)، (تفاصیل: "محقق")۔

سوال ۶: یہ اعتراض پہلی بار "درفش" میں کیا گیا ہے، احمد اور غالب میں مابہ النزاع نہیں۔ برہان نے دوسری فرہنگوں سے لیا ہے اور "شش ضرب نتیجۂ خوب" یا "شش نتیجۂ خوب" فرہنگوں میں ظاہرا انوری کے ان دو شعروں کی وجہ سے شامل کیا گیا ہے:

زبہرِ جشنِ تو دائم بہ شش نتیجۂ خوب
ز فرِ بختِ تو آبستن است شش مسکن
صدف بہ گوہر و نافہ بہ مشک و نے بہ شکر
شجر بہ میوہ و خارا بہ زر و خار بہ من

(کلیات، ص ۳۱۱)

فرہنگ نگاروں کے مسلک کی توضیح "محقق" میں ملے گی۔

سوال ۷: "چشمِ مخالفاں بیازن بہ تیر"۔ "سوئد" میں "نوادرالمصادر" کے حوالے سے فرخی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور اس میں مصرعِ ثانی اس طرح ہے:

ہمچو کفِ دلے برز آز دے *

---

* انتخابِ کلیات (لاہور) میں یہ بیت نہیں اور جنابِ عرشی سے معلوم ہوا کہ کلیاتِ طبعِ طہران میں بھی نہیں۔

غالب نے اعتراض سے پہلے "نوادر" کو، جو ایک مطبوعہ کتاب تھی، دیکھ لینا ضروری تصور نہ کیا۔ غالب اگر عروضِ فارسی کے ارتقا سے واقف ہوتے اور انھوں نے شعراے ایران کے کلام کا ایک عروضی کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو اس مصرع کو ناموزوں نہ کہتے۔ یہ مصرع، جیسا کہ احمد نے "شمشیر" میں لکھا ہے، "بحرِ سریع" میں ہے اور اس کا وزن "مفتعلن، مفاعلن فاعلان" ہے۔ انھوں نے اس بحر کے بارے میں طوسی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

> امّا بہ پارسی ہم ارکانِ مطوی بہ کار دارند و بر سالم و مخبون(۶۰) شعر زیادہ است۔ امّا آنچہ عروضیاں بہ تکلف گفتہ اند از جہتِ تشبہ بہ عرب۔
> ("معیار الاشعار"، ص۶)

ایرانیوں کو اس بحر کے سالم ارکان مطبوع نہیں ہوئے اور انھوں نے "مستفعلن" کی جگہ "مفتعلن" (مطوی) اور "مفعولات" کی جگہ "فاعلان" اور "فاعلن" (مطویِ موقوف یا مطویِ مکشوف) لانا پسند کیا اور "مفتعلن مفتعلن فاعلن" یا "فاعلان" فارسی کے بہت مقبول اوزان میں ہے۔ "مفاعلن" (مخبون) عربی میں آتا ہے، فارسی میں اس کا جواز "معیار الشعرا" کے علاوہ "المعجم" (ص۱۳۳) سے بھی ثابت ہے، بلکہ موخرالذکر میں مخبون مکشوف کی مثال میں یہ بیت دی ہے:

دو غمزہ چوں دو ناچخ (۶۱) لشکری
بے کنی بہ ہر دواں دلبری

(ص۱۳۴)

اس میں اور "چشم۔۔۔الخ" میں دو فرق ہیں ایک یہ کہ "چشم۔۔۔الخ" میں صدر (یعنی رکنِ اوّل) مطوی ہے اور "دو غمزہ۔۔۔الخ" میں مخبون، دوسرے یہ کہ عرض (یعنی رکنِ آخر) "چشم۔۔۔الخ" میں "فاعلان" ہے اور "دو غمزہ۔۔۔الخ" میں "فاعلن"۔

"بحرِ سریع" یا اور بحروں میں ایک بیت تک میں "فاعلان" اور "فاعلن" کا اجتماع جائز ہے:

ہر کہ تواند کہ فرشتہ شود
خیرہ چرا باشد و دیو و ستور (۶۳)

رہا "مفاعلن" کی جگہ حشو (درمیانی رکن) میں "مفتعلن" کا استعمال تو اس بحر میں اس کی ممانعت نہیں اور "مفتعلن مفاعلن فاعلان" میں "مفتعلن مفاعلن فاعلان" سے کم ثقالت ہے(۶۴)۔ یہ وزن (۶۵) عروض کی کسی کتاب میں یا شعرِ زیرِ بحث کے علاوہ شعرا کے کلام میں نہیں ملتا تو مضائقہ نہیں۔ کتابوں میں بہت سے ثقیل اوزان نہیں دیے، اصول موجود ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس بحر میں کون کون زحافات مستعمل ہیں اور قدیم شعرا کا بہت کلام ضائع ہو گیا ہے۔ ایرانیوں نے کئی بحریں ایجاد کی ہیں، جن میں سے کچھ مقبول ہوئیں اور کچھ متروک قرار پائیں۔ پرانی بحروں سے نئے اوزان بھی ایران میں نکلے ہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ رباعی کے اوزان "بحرِ ہزج" سے مستخرج ہوئے ہیں۔ "متفاعلن" ہشت رکنی ("بحرِ کامل") نہ "المعجم" میں ہے، نہ "معیار الشعرا" میں، حالاں کہ یہ فارسی کے شیریں ترین اوزان میں ہے۔ فرخی قدما میں ہے، اس کے زمانے کے بعض اوزان متوسطین یا متاخرین میں مقبول نہ ہوئے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔

سوال ۸: فضول(۶۶) سوال ہے کوئی شخص "آہنگ" کو ماضی نہیں کہہ سکتا۔ "برہان" میں یا تو سہوِ جامع ہے یا غلطِ کاتب۔ احمد نے اس کا اعتراف کر لیا ہے، اور یہ معاملہ فریقین میں مابہ النزاع نہیں (تفاصیل: "راست")۔

سوال ۹: بے شک غالب کا اعتراض صحیح ہے۔ احمد نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، مگر غالب خود فحش گوئی سے محترز نہیں۔

سوال ۱۰ و ۱۱: یہ اعتراض پہلی بار "درفش" میں ہوئے اور فریقین میں مابہ النزاع نہیں۔ دونوں اعتراض صحیح ہیں، لیکن سوال ۱۱ میں جو اعتراض ہے وہ حاشیۂ "برہان" میں بھی ہے۔

سوال ۱۲: ہندوستانی لفظ بے شک "گگھری" ہے۔ احمد بھی یہی لکھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ قول ہے کہ:

غلط کردنِ فارسیاں در حرفِ لفظِ ہندی از نا آشنائیِ زبان است۔

(ص ۲۳۲)

فارسی میں کافِ عربی و فارسی بہ کثرت ایک ہی مرکز سے لکھے جاتے تھے۔ برہان یہ سمجھا کہ کافِ عربی سے ہے۔ یہ غلطی ایسی نہ تھی کہ اس کے متعلق سوال کیا جاتا۔

سوال ۱۳: "چکری" کے بارے میں برہان لکھتا ہے:

بوزنِ "شُقری" "از ریواس [باشد] و بہ ہندوستان دختر را گویند۔

غالب نے اعتراض کیا تھا:

...در لہجۂ معتیت... "چوکری" می گویند... نہ "چکری"۔"

احمد نے جواب دیا ہے کہ:

"واو" نیز در بعض الفاظ ساقط شود... مثلِ "سوگھڑ" حالی... "سگھڑ" بر وزنِ "بشر" آوردہ... ع:

نازنیں، شوخ، طرحدار، سگھڑ سے می خواہد

(ص ۲۳۰)

غالب نے "تیغ" میں دعویٰ کیا ہے کہ:

جو علما و شعرا ایران سے آئے، لہجہ ان کا ہندی نہیں ہوا۔ املا اہلِ ہند کی املا کے موافق رہی۔ (ص ۴۴)

یہ زبردستی ہے، بہت سے لفظوں کا املا بھی بدلا ہے۔ اردو کے ادبی استعمال سے قبل صحیح املا معلوم بھی بہ مشکل ہو سکتا تھا۔ "برہمن" ہی کو لیجیے، ہندوستان کی کس زبان میں اصلاً اس طرح تھا۔

سوال ۱۴: "پاؤ" کے بارے میں احمد نے "خالق باری" کا یہ مصرع:

یہ دو دست ہات و قدم پاؤ کہیے

(قافیہ جاؤ) پیش کیا تھا (ص ۱۷۳)۔ غالب "تیغ" میں، اسے تسلیم کیے بغیر کہ یہ امیر خسرو کا ہے، یہ لکھتے ہیں کہ پہلے "پاؤ" بولتے ہوں گے۔ شاہ جہاں کے عہد میں یہ زبان نہ تھی (۶۷)، ("تیغ"، ص ۲۱)۔ اس عہد کی ہندوستانی زبان کے متعلق غالب کی معلومات کچھ نہ تھی، تحقیق کیے بغیر ایک بات لکھ دی۔ پھر یہ کہ ہندوستانی لفظ میں اگر برہان نے غلطی کی اور وہ بھی بہ تتبعِ جہاں گیری تو اس سے اس کی فارسی دانی پر حرف نہیں آسکتا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں برہان کو بڑا فارسی داں تصور کرتا ہوں۔ میری رائے میں وہ تحقیق سے بہت کم واسطہ رکھتا ہے اور مقلدِ محض ہے۔

سوال ۱۵: احمد کو "بپریشد" کی صحت پر اصرار نہیں ("مؤید"، ص ۱۷۴)، اس لیے اس کے بارے میں سوال فضول ہے۔ احمد کے اس قول کا، کہ "پریشاں" "پرشیدن" سے ماخوذ ہے، غالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سوال ۱۶: یہ اعتراض بھی پہلی بار "درفش" میں کیا ہے اور فریقین میں مابہ النزاع نہیں۔ "شمشیر" میں احمد نے اس اعتراض کو صحیح مانا ہے۔ (ص ۹۲)

[۴] میر ولایت علی کے نام کا خط "فیضِ صفیر" (۶۸) ("رشحاتِ صفیر") کی اشاعتِ ثانی (۶۹) سے ماخوذ ہے۔ غالباً اشاعتِ اوّل (۷۰) میں یہ خط نہ تھا اور "فیضِ صفیر" کا جو خلاصہ (۷۱) حال میں چھپا ہے، اس میں بھی یہ خط شامل نہیں۔ صفیر بلگرامی نے اس خط کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ "ٹکٹ" مؤنث بھی ہے لیکن مجھے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ اس سے "ٹکٹ" کی تانیث ثابت نہیں ہوتی (۷۲)، (خط بنام راقم)۔ میر ولایت علی کے متعلق تحقیقات سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی اور نہ اُس خط کا پتا چلا جو اس سے پہلے غالب نے میر ولایت علی کو لکھا تھا (۷۳)۔ اس خط

کا لفافہ البتہ "س" میں محفوظ ہے۔ اس پر یہ عبارت مندرج ہے:

در عظیم آباد پٹنہ بہ محلہ کشمیری کوٹھی مطبعِ عظیم المطابع موصول و بہ خدمتِ جناب میر ولایت علی صاحب مہتمم مطبعِ مذکور زاد مجدہٗ مقبول باد۔ بیدڈ، ضروری، جواب طلب۔

لفافے پر مہر بھی ہے، جس کا نقش "غالب ۱۲۷۸" (۷۳) ہے۔ اس لفافے کا عکس جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس مقالے کے ساتھ شائع کیا ہے جس کا عنوان "غالب کے لفافے" ہے اور جو اپریل ۱۹۳۳ء کے "ہندُستانی" (۷۵) میں چھپا تھا (۷۶)۔ صفیر بلگرامی "جلوۂ خضر"، جلد ۱ (ص ۲۲۲)، میں لکھتے ہیں کہ:

جب میں نے "بوستانِ خیال" کو اردو کر کے اس کی ایک جلد عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعۂ "اودھ اخبار" مشتہر ہوا، حضرتِ غالب نے ایک خط، مع اس کی قیمت کے، میرے پاس پٹنہ میں بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی۔

یہ اسی خط کی طرف اشارہ ہے، گو مکتوب الیہ میر ولایت علی ہیں (۷۷)۔ "بوستانِ خیال" مترجمۂ صفیر کی ایک جلد میں نے لڑکپن میں دیکھی تھی، اس وقت باوجودِ تلاش نہ مل سکی۔ غالباً اور جلدیں نہیں چھپیں، بلکہ یہ بھی یقین نہیں کہ صفیر نے اور جلدیں بھی ترجمہ کی تھیں (۷۸)۔ "فیضِ صفیر" میں "حافظ معلوم" ہے، یہ غالباً سہوِ کاتب ہے، "حافظ معدوم" ہونا چاہیے (۷۹)۔

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

نظامی کا مصرع ہے اور "مخزن الاسرار" میں ہے (ص ۱۰۹)۔ [پہلا] مصرع یہ ہے:

عیبِ جوانی نہ پذیرفتہ اند

صفیر بلگرامی نے غالب سے اپنی ملاقات کا مفصل حال "جلوۂ خضر" جلد دوم میں لکھا ہے۔ میں نے اسے غالباً ۱۹۳۷ء میں رسالہ "اردو" میں چھپوا دیا تھا (۸۰)۔ ان کے نام کے اردو خط بھی ہیں، مگر وہ "جلوۂ خضر" جلد ۲ میں ہیں اور وہ اس وقت نہ مل سکی۔

[۵] دو فارسی شعروں کے مطلب خود غالب کے قلم سے علی الترتیب "کم" کے ورق ۱ے اور ۶/۲ے پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے عکس جناب خان صاحب قاسم حسن ناظم "م" کی عنایت سے حاصل ہوئے ہیں۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

۲

حواشیِ نظمِ اردو

[۶] "پنج آہنگ" کی اشاعتِ اول (۱) کے نسخے نہایت کم یاب ہیں۔ اس کا منظوم اشتہار "اسعد الاخبار" آگرہ (۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء) میں چھپا تھا (۲)۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد علی الترتیب یہ عبارتیں تھیں:

نقلِ اشتہارِ منظومِ طبعِ "پنج آہنگ"، مصنفۂ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب، جو اپریل میں قیمت بھیج دے، تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار بہ سبیلِ ڈاک میرے ایک مخدومِ والاشان نے، واسطے درج کرنے اخبار کے، میرے پاس بھیجا۔

غلام نجف خاں، جن کے نام سے یہ اشتہار ہے، غالب کے شاگرد تھے ("خطوط"، ص ۲۲۴ و ص ۲۳۲)، لیکن یہ تلمذ ظاہرا فارسی پڑھنے تک محدود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا۔ اشتہار غالب کی طرز میں ہے، اور قریب بہ یقین ہے کہ انھیں کا لکھا ہوا ہے (۳)۔ غالب کے لیے خودستائی کوئی نئی بات نہیں اور اشتہار کی تو ذمے داری بھی ان کے سر نہیں۔ یہ اس بسیط مقالے میں بھی شامل تھا جو میں نے "اسعد الاخبار" پر "معاصر" میں لکھا تھا (۴)۔ غلام نجف کے حالات "آثار الصنادید" اور "واقعاتِ دار الحکومت

دہلی"، مصنفہ بشیر احمد مرحوم، میں ملیں گے۔ ان کے والد کا نام محمد مسیح الدین (۵) اور اصلی وطن بدایوں تھا۔ مگر بہت کم سنی ہی میں دہلی آ گئے تھے (۶)۔ اپنے زمانے میں دہلی کے حاذق اطبا میں گنے جاتے تھے اور ہمارے زمانے کے شفاء الملک حکیم رضی الدین مرحوم ان کے پوتے تھے۔ ان کے نام "خطوطِ غالب" میں ۲۳ خط ہیں، ان سے بہت گہرے تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ غالب ان کے منہ بولے باپ تھے اور یہ امراؤ بیگم کو "ماں" سمجھا کرتے تھے (ص۲۱۹ و ۲۳۲)۔ غالب نے ان کے بیٹے کو جو "پوتا" لکھا ہے وہ شاید اسی بنا پر ہے (ص۲۲۸)، مگر غالب اور ان کے بیٹے میں خون کا رشتہ بھی ہے (۷)، (ص۲۲۸)۔ غالب نے غلام فخرالدین خاں، اپنے حقیقی بھائی کے نواسے (۸)، کی رہائی پر غلام نجف کو مبارک باد دی ہے۔ گمان ہے کہ یہ رشتہ بھائی کے ذریعہ سے ہو۔ محمد نجف جن کے نام کا ایک خط "پنج آہنگ" میں ہے اور جن کا ذکر اس کے صفحہ۷ پر بھی ہے اور ان کے بھائی محمد حمید الدین (ص۷۱ و ۸۸) یقین ہے کہ غلام نجف کے اقربا سے ہوں (۹)۔

[۷] غالب کے خسر، الٰہی بخش خاں معروف (متوفی: ۱۲۴۳ھ) (۱۰) نے ان کی دو غزلوں کو، جن میں سے ایک کی ردیف "ہوتے تک" اور دوسری کی "کروں یا نہ کروں" ہے، مخمس کیا تھا۔ اور یہ دونوں مخمس دیوانِ معروف میں موجود ہیں۔ دوسری غزل کا مخمس "چمنِ بے نظیر" (۱۱) میں بھی چھپا ہے۔ "کروں یا نہ کروں" ردیف والی غزل میں نے مارچ ۱۹۳۶ء کے "معیار" میں شائع کی تھی (۱۲)۔ یہ اس زمانے کی غزل ہے جب غالب "اسد" تخلص کرتے تھے، مگر اس میں وہ دقت آفرینی نہیں جو اس عہد کی غزلوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ غالب کے یہاں معروف کا ذکر تین جگہ آیا ہے۔ دو خطوں میں ان کا ایک ایک مصرع نقل کیا ہے ("خطوط"، ص۱۸۸ و ۳۵۳)، اور ایک میں لکھا ہے کہ معروف نے ایک نئی زمین "شراب تو دے، واب تو دے" نکالی، میں نے حسب الحکم غزل کہی ("خطوط"، ص۳۳۴)، اس زمین میں معروف اور ذوق کی بھی غزلیں ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں کہ ذوق سے مشورت کا ذکر آزاد کے سوا کسی نے نہیں کیا۔ "آبِ حیات" کی اشاعت سے پہلے "تاریخِ جدولیہ" (۱۳) کا مصنف لکھ چکا ہے:

قطعِ نظر شاعری کے فقیر بھی تھے(۱۴)، محاورہ بندی میں اچھے۔ کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی۔ (ص ۱۴۴)

یہ امر کسی طرح محقق نہیں کہ جب غالب مستقل طور پر دہلی میں اقامت گزیں ہوئے تو ان کا قیام معروف کے ساتھ تھا۔ شجرے کے متعلق جو حکایت "یادگار" میں ہے (ص ۱۰۶)، مجھے مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

[۸] یہ دو شعر جو میر سعادت علی(۱۵) کی ہجو میں ہیں "لطائف" سے ماخوذ ہیں (لطیفۂ ۷)۔ سعادت اتنے غیر معروف آدمی نہ تھے جتنا کہ "لطائف" کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ میر منشیِ دفترِ فارسیِ محکمۂ عالیہ، صاحبِ انتظامِ کل امور... متعلقہ... راجستھان، رہ چکے تھے اور انھیں "لطائف" میں جو سررشتہ دارِ معزول (لطیفۂ ۶) لکھا ہے، یہ غالباً صحیح نہیں(۱۶)۔ غالب نے "تیغ" (ص ۲۴) میں انھیں دولت مند بتایا ہے، یہ غلط نہ ہوگا۔ غالب سے ذاتی تعلقات بھی ہوں گے ورنہ وہ سعادت کی بنائی ہوئی مسجد اور کنویں کا قطعۂ تاریخ نہ نظم کرتے(۱۷)، ("مسجد"، ص ۳۱)۔ سعادت کی کتاب "محرق" ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوئی تھی۔ مطبعِ احمدی دلہائی (کذا) نے اسے چھاپا تھا(۱۸)، یہ خیال کہ یہ مطبعِ سراجی کے مالک تھے، صحیح نہیں۔ ان کی وفات "تیغ" کی تصنیف سے کچھ قبل وقوع میں آئی تھی۔ اس میں ان کا ذکر بہ صیغۂ ماضی ہے(۱۹)۔ "محرق" کی وجہِ تصنیف انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ میں نے ایک کتاب "حدائق العجائب" لکھی تھی اور اس کی تصنیف میں "برہان" سے بھی مدد لی تھی۔ "قاطع" میں جن لغات پر اعتراض ہیں ان میں سے ۲۴ "حدائق العجائب" میں بھی تھے۔ "رشیدی"، "جہاں گیری" وغیرہ کی طرف رجوع کیا تو اعتراض غلط نظر آئے۔ اندفاعِ اعتراض ہائے غالب کے لیے یہ کتاب تحریر کی۔ سعادت نے بہت سی باتیں ٹھیک لکھی ہیں لیکن اس کی طرزِ تحریر لچر ہے اور آسانی سے اس کی تضحیک کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے غالب سے برہان کا انتقام بھی لینا چاہا ہے اور اس کا اصولاً انھیں حق نہ تھا۔ سب سے زیادہ قابلِ اعتراض دو باتیں ہیں: ایک تو غالب کو کنایتاً عبدالصمد کا معشوق قرار دینا (تفاصیل: "راست") اس عبارت کے علاوہ جو "تشت" میں نقل ہوئی ہے ایک اور عبارت سے یہ

مطلب نکلتا ہے (ص ۵۴)، دوسرے یہ تحریک کرنا کہ غالب حکیم محمود خاں سے اپنے اختلالِ حواس کا علاج کرائیں۔ سعادت نے یہ بھی لکھا ہے کہ غالب کا کلام قدر کا مستحق نہیں۔ غالب ان کے لہجے کے بہت شاکی ہیں:

یہ مناظرہ ہے یا پھکڑ؟ صاف (۲۰) معلوم ہے کہ ایک بھیڑا تالیاں بجا کر گالیاں دیتا ہے، یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے (لطیفۂ ۲)

ناخدائے شیرازی کے نام کے خط میں اسی قسم کی باتیں کہی ہیں ("پنج"، ص ۱۲۱) غالب نے دو رسالے دوسروں کے نام سے "محرق" کی تردید و تضحیک میں لکھے: "رسالۂ عبدالکریم" اور "لطائف" (۲۱)، تیسرا رسالہ "دافعِ ہذیان" (۲۲) اگرچہ خود غالب کے قلم سے نہیں، لیکن میرا قیاس ہے کہ ان کے کسی معتقد کی تحریک سے تحریر ہوا ہے (۲۳)۔ "رسالۂ عبدالکریم" کی نقل مجھے جناب مہیش پرشاد نے عنایت کی ہے، ان تینوں کے متعلق غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

تین دوستوں نے مولفِ "محرق" پر ... جوتی پیزار کی ہے (۲۴)، ("عود"، ص ۲۰۱)۔

ان کے لہجے کی نسبت اس سے کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ حالی نے لکھا ہے کہ مرزا سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے "قتیل" کا جواب نہیں دیا۔ مرزا نے کہا، "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے (۲۵) تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟" ("یادگار"، ص ۵۲)۔ یہی بات "رسالۂ عبدالکریم" میں "محرق" سے متعلق ہے۔

[۹] (الف) "بے چارہ ... پاؤں"، مروجہ دیوان میں اس زمین میں ایک غزل ردیفِ واو میں موجود ہے، مگر یہ شعر اس میں نہیں۔ میں نے اسے "سراپا سخن"، مصنفۂ محسن لکھنوی، سے لے کر "معیار" بانکی پور (جولائی و اگست ۱۹۳۶ء) میں شائع کیا تھا۔ تفاصیل اس میں ملیں گے۔ حال میں آرزو صاحب نے دیوانِ اردو کا ایک قلمی نسخہ مجھے بھیجا ہے۔ جو بظاہر اشاعتِ ثانی کی نقل ہے۔ اس میں بھی یہ شعر ملتا ہے (۲۶)۔ غالب نے بظاہر اپست سمجھ کر اسے اشاعتِ ثالث سے خارج کر دیا۔ مروجہ دیوان اسی پر مبنی ہے۔

(ب) "کوئی ... لو صاحب"، "لطائف" کے لطیفۂ ۱۰ سے ماخوذ ہے۔

۳

حواشیِ نثرِ فارسی

[۱۰] "قاطع برہان" کی تقریظ اس کے صفحہ ۹۷ پر ہے، اور اس کا عنوان "تقریظِ مصنّف" ہے تقریظ کے معنی "لسان العرب" (جلد ۵، ص ۳۳۵) میں "مدح الانسانِ وھو حیّ" لکھے ہیں(۱) خود مصنّف اپنی کتاب کی نسبت جو رائے ظاہر کرے، اسے تقریظ کہنا ٹھیک نہیں، اس تقریظ کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ "قاطع" کے چھاپے کے لیے نواب یوسف علی خاں کا دو سو روپے دینا افسانۂ محض ہے (تفاصیل: "راست"، ص ۳۸)۔ آغازِ تقریظ جس بیت سے ہے، وہ "سبد" میں ہے(۲)، (ص ۷۳)۔ "چشم نابستہ(۳)۔ الخ" جامی کا ہے یا نہیں، اس بارے میں فی الحال کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ رباعی، جس کے مصرعِ آخر کے اوپر ۱۲۷۸ھ مرقوم ہے، "گ" یا "سبد" میں نہیں(۴)۔ تقریظ کے آخر میں مہر ہے، جس کا نقش "نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷" ہے۔ "قاطع" کا چھاپا ۱۲۷۸ھ میں بیسویں رمضان [مطابق ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء] کو مکمل ہوا۔ حالی نے اس کا سالِ الطباع غلط بتایا ہے۔ "درفش" ۱۲۸۲ھ [۱۸۶۵ء] میں چھپی ہے، اس کا سنہ بھی حالی نے صحیح نہیں لکھا(۵)، ("یادگار"، ص ۴۴)۔ یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ "قاطع" کی کتابت شیخ اسیر اللہ تسلیم نے کی تھی۔ ان کا تخلص درج نہیں(۶)، لیکن خط انھیں کا ہے اور وہ فارسی مثنوی جو غالب اور "قاطع" کی مدح میں انھوں نے لکھی ہے اور "قاطع" میں موجود ہے، تسلیم کے طرز میں ہے۔ مزید یہ کہ تسلیم کا اس زمانے میں نول کشور کے یہاں کتابت کرنا ثابت ہے۔ تسلیم کے استاد نسیم کی ایک مثنوی بھی "قاطع" میں ہے۔ انھوں نے "عجائبِ دل رُبا ارشادِ غالب" سے عیسوی سالِ طبع نکالا ہے۔

[۱۱] "سفرِ تیغِ وساتیر" محمد نجف علی خاں کی تصنیف اور ۱۲۸۰ھ [۱۸۶۴ء] کی مطبوعہ ہے(۷)۔ اس میں مصنّف نے یہ التزام تو نہیں کیا کہ عربی الفاظ نہ آنے پائیں لیکن

دساتیری الفاظ کے برتنے سے احتراز نہیں کیا۔ غالب کی تقریظ سے پہلے یہ عبارت ہے:

تقریظے کہ والا فرگاہ، خردی راز آگاہ، ستودہ گفتار، سخن پرور، سرمایۂ نازشِ کمالِ ہنر جناب مرزا اسداللہ خاں المتخلص بہ غالب المشہور بہ میرزا نوشہ ادام اللہ تعالیٰ مجدہم برین نامہ نگاشتہ۔

ان کا ترجمہ "تذکرہ" میں یوں درج ہے:

خستہ ولمعی تخلص، مولوی محمد نجف علی خاں ابن قاضی محمد عظیم الدین خاں مرحوم قاضی قصبۂ جھجر، استادِ نواب ناظم بہادر مرشد آباد و مہاراجۂ الور است۔ مدّتے بہ رفاقتِ نواب محمد وزیر خاں بہادر(۸) و نواب محمد علی خاں بہادر(۹) والیانِ ٹونک بودہ۔ ادیبِ بے نظیر و محققِ بے مثلِ زبانِ عربی و دری ست۔ حالِ علم و فضل و ذہن و ذکاوتش از تالیفاتِ کثیرۂ او مثلِ "تفسیرِ غریب" بہ عبارتِ فارسی و شرحِ غیر منقوط بر "مقاماتِ حریری" بہ زبانِ دری و شرحِ "تحفۃ العراقین"... بہ زبانِ دری و شرحِ "دساتیر" مسمیٰ بہ "سفرنگِ دساتیر" بہ زبانِ فارسی و تاریخِ غدرِ ہندوستان بہ زبانِ دری مسمیٰ بہ "ویژۂ نواو" و "وزیر نامۂ" منظوم بہ زبانِ دری بنام محمد وزیر خاں والیٔ ٹونک و نظم ترجمۂ منبہاتِ(۱۰)؟ ابن حجر عسقلانی(۱۱) وحاشیۂ "مطول" بہ زبانِ عربی وحاشیۂ "ہدایہ" فقہ و "توضیح المعانی" و "ایضاح البیان" و "بدیع البدیع" و "لب الالباب" و "خلاصۃ الافکار" و شرحِ "شرحِ چغمنی" و "تذکرۂ شق القمر" و "دری کشا" و زبدۃ الغرائب" و "تکملۂ "صولتِ فاروقی" منظوم بہ زبانِ دری و "قصۂ ہیر و رانجھا" منظوم و ترجمۂ "تقویت الایمان" بہ زبانِ عربی و "تاریخِ مرشد آباد" و شرحِ "نل دمن" فیضی بہ زبانِ دری و ترجمۂ انجیل وغیرہ تواں دریافت۔ تقریظے... بر رسالۂ "شاہدِ عشرت"... نگاشتۂ قلم... اوست۔ بارہا ملاقاتش در مرشد آباد و بنارس و بیر بھوم دست دادہ۔ از احبابِ گرامی راقم است۔

حکیم حبیب الرحمان مرحوم نے مجھے اطلاع دی تھی کہ "ارمغان"، نساخ کے چوتھے دیوان (۱۲)، میں ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ ہے، جس کا مصرعِ آخر یہ ہے:

زد رقم منزلِ خستہ بشنو

اس سے ۱۲۹۸ھ نکلتا ہے (۱۳)۔

"صبحِ گلشن" میں ہے کہ:

نجف، مولوی نجف علی خاں از [اربابِ علم و فضل] الور تجارہ... اندک (۱۴) خفقانے بر مزاجش استیلا داشت و در فکرِ ترقیِ جاہ و منصب قدم از ریاستے بہ ریاستِ دیگری گذاشت... توراۃ را... در سلکِ نظم در آوردہ و مثنویِ ہفت پیکار (کذا)... و غیر ذالک... موزوں کردہ پنج شش سال قبل ازیں در... بھوپال مہتممِ عدالتِ دیوانی بود۔ دریں زماں می گویند کہ ملازمتِ... والیِ جے پور اختیار نمود (ص ۵۰۵)۔

غالب سے ان کی ملاقات نہ تھی (۱۵)، ("اردو"، ص ۳۱)۔ "دافعِ ہذیان" انھوں نے غالباً غالب کے کسی معتقد کی تحریک سے ۱۲۸۱ھ میں سعادت کی مخالفت میں لکھی تھی، مگر اس میں محض چند اعتراضات سے بحث کی ہے اور وہ بھی بیش تر لاطائل۔ مطبوعہ نسخہ میں نے دیکھا ہے، مگر پڑھا نہیں۔ میرے پاس جو اس کی نقل ہے وہ جناب سید بشیر حسین زیدی بالقابہ وزیرِ اعظم ریاست رام پور کی اجازت سے کتب خانۂ ریاست کے نسخے سے لی گئی ہے، میں ان کا رہینِ منت ہوں۔

نجف اپنی نثر میں دساتیری الفاظ لانے کے بہت شائق ہیں اور اس کے علاوہ اور تدابیر بھی اختیار کرتے ہیں کہ ان کی نثر آسانی سے دوسروں کی سمجھ میں نہ آئے۔ غالب میں اور ان میں "من تُرا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" کا معاملہ ہے غالب نے ان کی تعریف میں بڑا مبالغہ کیا ہے۔ تقریظ میں جو اشعار ہیں وہ بے شبہ غالب کے ہیں اور تقریظ کے لیے لکھے گئے ہیں، کہیں اور نہیں ہیں۔

[۱۴] "دری گشا" ۱۲۸۴ھ میں چھپی ہے (۱۶)۔ پٹنہ میں اس کا جو نسخہ ہے اس کا اس

وقت مطالعہ ممکن نہیں(١٧)۔ تقریظ(١٨) کی نقل مختار الدین آرزو صاحب نے بھیجی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کا عنوان یہ ہے: "تقریظِ طبع زادِ جناب نواب نجم الدولہ اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بہ غالب۔"

"رسالۂ عبدالکریم" کے آخر میں ایک استفتا ہے، جواب دینے والوں میں ایک 'نجف علی' بھی ہیں۔ عجب نہیں کہ یہی ہوں۔

۴

حواشیِ نظمِ فارسی

[١٣] مثنوی "وفا جو ہر از تو غم دور باد" الخ، "یک م" سے ماخوذ اور اس کے ص ١٠ کے حاشیے پر درج ہے(١)۔ اس کا عنوان "یا اسد اللہ الغالب"(٢) ہے اور غالباً خود غالب کی لکھی ہوئی ہے۔ "یک م" کا مفصل ذکر کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور کی اس فہرست میں ہے جو متأخر فارسی گو شعرا کے مخطوطات کے لیے مخصوص ہے۔ فہرست نگار کا یہ بیان صحیح نہیں کہ کاتب نے سالِ کتابت ١١٥٣ھ لکھا ہے، اس سے قطعِ نظر، کہ ہندسہ ١٢٥٤ مرقوم ہے، کتاب کی آخری سطر یہ ہے:

> یازدہم ربیع الآخر سنہ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و چہار ہجری دہلی از خطِ
> بدخط ضعیفل (کذا) مہمل ست اتمام پذیرفت۔

فہرست نگار کی نظر متعدد مقامات پر، جو غالب کے ہاتھ کی تحریریں ہیں ان پر بھی، نہیں پڑی۔ قریب بہ یقین ہے کہ کاتب رائے چھج مل ہیں۔ جن کے نام کے پانچ خط "پنج" میں ہیں۔ جس زمانے میں غالب کلکتے گئے ہیں، بہ ظاہر یہ نواب احمد بخش کی سرکار سے متعلق تھے، مگر اس کے باوجود غالب اعتماد کا اہل سمجھتے تھے۔ بعد کو بیگم سمرو کے سفیر بھی ہو گئے تھے ("پنج"، ص ٧٥)۔ اپریل ١٨٥٣ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ یہ "آفتابِ

سر کوہ" ہیں ("خطوط"، ص ۱۰۶)۔ تعجب نہیں کہ اس کے کچھ بعد ان کی وفات ہوئی ہو(۳)۔
"ک م" کے متعلق عام معلومات کا ماخذ جناب شیخ محمد اکرام کا "غالب نامہ" ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں کہ اس کا نام "مے خانۂ آرزو" ہے۔ یہ ہو یا "ک" کا کوئی دوسرا نسخہ، "مے خانۂ آرزو" یا کوئی دوسرا خاص نام کسی پر مرقوم نہیں۔ وہ نسخہ، جس کا ذکر "پنج" کی تمہید میں علی بخش خاں نے کیا ہے، "مے خانۂ آرزو" نہیں، "مے خانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے موسوم تھا،* جیسا کہ عبارتِ ذیل سے ظاہر ہے:

در آں ایام دیوان کہ مسمیٰ بہ مے خانۂ آرزو سرانجام است، تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ۔

یہ نسخہ ۱۲۵۴ھ سے قبل کا لکھا ہوا ہے(۴) اور ظاہرا معدوم ہے۔

"ک م" میں اس مثنوی کے سوا کوئی غیر مطبوعہ مثنوی نہیں اور یہ مثنوی، جہاں تک مجھے علم ہے، کلیات کے کسی دوسرے نسخے میں نہیں۔ اس میں خطاب جوہر سے ہے اور مطالب ان کے والد کی طرف سے ہیں۔

جوہر کے نام کے تین فارسی خط "پنج" میں اور اتنے ہی اردو خط "خطوط" میں ہیں۔ جناب سید وزیرالحسن عابدی مجھ سے کہتے تھے کہ ان کے نام کے غیر مطبوعہ خطوط موجود ہیں(۵)۔ غالب کے کلیاتِ فارسی میں ایک رباعی ہے جس میں جوہر اور میکش کی تعریف کی ہے، (ص ۵۱۱)۔ جوہر کے قطعاتِ تاریخ اردو "کاطع"، "درفش" اور "لطائف" میں موجود ہیں اور متقدم الذکر کی اشاعت کے محرک اولیں یہی تھے۔ ان کا کلام زیادہ نہیں ملتا۔ "تذکرہ" میں ہے کہ پانچ چھ برس قبل انتقال کیا(۶)۔

[۱۴] غالب نے لکھا ہے کہ:

بیچ گاہ دل بہ فنِ تاریخ و معما ننہادہ ام(۷)، ("پنج"، ص ۸۱)۔

لیکن تین معمے "ک م" اور "ک م ا" میں موجود ہیں، پہلے کا حل عبداللہ ہے: "بد" بہ چشم، یعنی

---

* اس کا اعتراف ضروری ہے کہ اس کی طرف جناب عرشی نے میری توجہ منعطف کرائی۔

"عین" کا اضافہ ہوا تو "عبد" بنا۔ یہ خدا، یعنی "اللہ" تک پہنچا تو "عبداللہ" ہو گیا۔ دوسرے کا حل کمال ہے۔ "کلام" کا کاف اپنی جگہ پر رہا اور لام مقلوب ہو گیا، "کمال" نکل آیا۔ تیسرے کا حل شیخ کمال ہے۔ نیم شب یخ بستہ = شیخ، گزرگاہِ خرام یعنی "م" اور "سرِ آب" یعنی الف، کاف (۸) اور لام کے درمیان آیا، شیخ کمال ہو گیا (۹)۔

[۱۵] رباعی "سبد چین" کی اشاعتِ اول سے ماخوذ ہے (۱۰)۔ جناب مالک رام کی اشاعت سے خارج ہے۔ نہ معلوم کس کی ہجو ہے۔

[۱۶] (الف) "ایں نسخہ۔۔ خرچنگ" "لطائف" کے سرورق پر ہے، یقین ہے کہ غالب کا ہو۔ "لطائف" میں غالب کا ایک فارسی شعر اور ہے، مگر اس قدر بے ہودہ کہ میں نے اسے "آثار" میں شامل نہیں کیا۔

(ب) "لاجرم۔۔۔ہیراس" اس شعر کی شانِ نزول یہ ہے: امیر حسن خاں بسمل (متوفیٰ: ۱۲۶۳ھ) (۱۱) عاشق علی خاں کاکوروی (۱۲) (متوفیٰ: ۱۲۵۶ھ) کے بیٹے تھے۔ جس زمانے میں غالب کلکتے پہنچے ہیں، وہاں موخرالذکر شاہِ اودھ کے سفیر تھے اور ان سے غالب سے تعلقات تھے ("پنج"، ص ۸۰ و ۹۸)۔ بسمل سے بھی کلکتے میں ملاقات ہوئی ہوگی، "پنج" میں بسمل کے نام کے دو خط ہیں اور ان کی مدح میں ایک رباعی کلیات میں ہے (ص ۵۰۷)۔ ان میں سے ایک خط (ص ۹۸) اور مظفر حسین خاں کے نام کے ایک خط (ص ۹۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ بسمل غالب سے ناراض ہیں اور وہ انھیں منانا چاہتے ہیں۔ بسمل کی خفگی کا سبب "تذکرۂ مشاہیرِ کاکوری" مصنفہ حافظ محمد علی حیدر (طبع: ۱۹۲۷ء) میں یہ درج ہے کہ بسمل نے کلکتے میں یہ شعر کہا تھا:

جملہ زاغند شاعرانِ جہاں
لیک یک طوطیِ شکرخا من

غالب نے سنا تو وہ شعر کہا جس کا قافیہ "ہیراس" ہے۔ اس کے بعد مراسلات ہوئے۔ اس سلسلے میں جو آخری خط غالب نے لکھا تھا، اس میں وہ مدحیہ رباعی تھی جو کلیات میں ہے۔

مصنف نے اپنے بیان کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا، لیکن یہ لکھا ہے کہ بسمل نے ۱۲۶۰ھ میں "پنج" کے جواب میں "پنج گلبن" تصنیف کی تھی، عجب نہیں کہ ان کا ماخذ بھی ہو۔ "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" کم یاب کتاب نہیں، مگر اس پر بھی "پیراہن" والے شعر اور اس کی شانِ نزول سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس شعر کے "تاثر" میں شمول کی یہ وجہ ہوئی۔

حصۂ دوم

[حواشیِ خطوطِ فارسی]

"ن" میں (ان) خطوط کے علاوہ جو "ن ا" میں ہیں، علی اکبر خاں کے نام کا ایک خط ("پنج"، ص۴۵)، "خاتمہ گلِ رعنا" کی نامکمل عبارت اور "بادِ مخالف" کی اوّلین روایت ہے۔ موخرالذکر سے متعلق میرا ایک مقالہ "اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن مسلینی" جلد نمبر:۱ میں چھپا ہے۔ "ن" اس وقت پیشِ نظر نہیں اور اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش ناکام یاب رہی۔ "ن" سے اس کے کاتب یا زمانہ کتابت کا حال (بھی) نہیں کھلتا۔ کاتب ظاہرا ذی علم نہیں، "ملاذی" کو "ملازی"، "پرسش" کو "پرشش"، "بالجملہ" کو "یاالجملہ" (۳ جگہ)، "باسم" کو "بسم" (اور) "مع" کو "معہ" لکھتا ہے۔ ذال کے معاملے میں کبھی غالب کی پیروی اور کبھی ان سے انحراف کرتا ہے۔ "بڑھ" کو "بھڑ" لکھنا غالباً غالب کا تتبع ہے۔ حکیم حبیب الرحمان مرحوم نے اپنے خط میں "ن" کو شائق جہاں گیر نگری کا مجموعہ لکھا تھا۔ اس کا مطلب ظاہرا تو یہ ہے کہ وہی اس کے مرتب تھے۔ ان کے خط میں شائق کی کم علمی کا بھی ذکر ہے۔ شائق سے اس مجموعے کا کسی نہ کسی قسم کا سروکار بالکل مستبعد نہیں۔ "ن" کے ساتھ شائق کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کئی جگہ شائق نے غالب کی عبارتوں کا سرقہ کیا ہے، مثلاً خط:۱۶ کی عبارت "تیرگیِ روزِ سیاہ... آرزوہ" (اور) خط:۱۵ کی عبارت "در آغازِ نامہ... بلاہا کہ از دہر کشید ستم"(۱) بجنسہٖ یا خفیف اختلاف کے ساتھ شائق کے یہاں موجود ہے۔

[۱]

"ن" میں تپاں(۲)، شائق، خواجہ محمد حسن، خواجہ فخرالله اور ایک نامعلوم الاسم مکتوب الیہ(۳) کے نام کے خطوط ہیں۔

مرزا احمد بیگ(۴) تپاں* دہلوی: نواب احمد بخش خاں کے برادرِ بزرگ(۵) کے سالے ("پنج"، ص ۵۲)، تپش کے شاگرد اور صدر دیوانی کلکتہ کے مختار تھے ("سخن"، ص ۳۰۲)، اور جاہ مندانہ زندگی بسر کرتے تھے ("پنج"، ص ۵۲)۔ عمر میں دس بیس برس غالب سے بڑے ہوں تو عجب نہیں۔ غالب نے انھیں اپنے احباب میں شمار کیا ہے ("پنج"، ص ۵۲)، لیکن سراج** کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> مرزا... را نسلِ نصراللہ [بیگ] خاں از آبائے خود می شمارم و ہرگز پیشِ میرزا در سیانۂ خود و حامد علی (پسرِ بزرگِ تپاں) فرق نمی کنم"(۶)۔ ("مت"، ص ۷۵)

دہلی کی ملاقات تھی یا نہیں، یہ کہنا مشکل ہے(۷)۔ کلکتے میں بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے، اور تپاں نے غالب کو اپنے ساتھ ٹھہرانا چاہا تھا مگر غالب اس پر راضی نہ ہوئے(۸)، (خط: ۳۶/۳۰)۔ دہلی پہنچ کر کچھ دن کے بعد غالب کو یہ گمان ہوا کہ مرزا(۹) حاجی کے سالے مرزا افضل بیگ نے، جہاں تک مرزا حاجی کے معاملے کا سروکار ہے، انھیں اپنا ہم خیال بنا لیا ہے:

> فلاں بیگ... در کونسل غبارِ فتنہ برانگیخت و مرا ایں معنی دریں دیار از خارج مکشوف شد۔ گفتم چہ امکاں دارد کہ مرزا صاحب بدیں معاملات عالم نباشند و باوجود علم چرا اغماض نکردند۔ ("مت"، ص ۳۹)

ایک بار قاسم سے تپاں کی شکایت کی ہے:

---

* تپاں اور ان کے استاد اپنا تخلص "ط" سے لکھتے تھے۔

** سراج الدین احمد۔

به پاسِ ربطِ فلاں بیگ طریقۂ فرستادنِ نامه و پیام با من مسدود کردند(۱۰)۔ ("مت"، ص ۹۵)

ظاہرا بعد کو صفائی ہو گئی تھی ورنہ تپاں اپنی اس خواہش کا اظہار غالب سے نہ کرتے کہ وہ افضل بیگ کی وفات کے بعد کلکتے میں شاہِ دہلی کا سفیر ہونا چاہتے ہیں ("مت"، ص ۶۰)۔

تپاں کی موت کے بعد غالب نے شیفتہ سے استدعا کی تھی کہ تپاں کا حال اور کلام اپنے تذکرے میں درج کریں ("پنج"، ص ۵۲)، گو اس کی کوئی صورت نہ نکلی۔ ظاہرا [نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں] سرور [متوفی ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء] کی زندگی میں ان کے تذکرے ["عمدۂ منتخبہ"] کے لیے تپاں کا جو کلام غالب نے دیا تھا اور اس میں کسی وجہ سے شامل نہ ہونے پایا تھا، سرور کے اخلاف سے شیفتہ کو نہ مل سکا۔ غالب نے ایک اردو غزل تپاں اور قاسم کی مدح میں کہی ہے ("مت"، ص ۱۰۵)، اور شیفتہ کے [نام کے] خط میں انھیں "شاعرِ سادہ گو" لکھا ہے۔ ان کا دیوان ناسخ نے دیکھا تھا مگر اب اس کا پتا نہیں۔ "سخن"، "گل دستۂ نشاط" اور "دیوانِ جہاں" میں جو کلام ہے، وہ کچھ بلند پایہ نہیں۔ ناسخ نے سالِ وفات ۱۸۳۳ء لکھا ہے لیکن یہ صحت سے دور ہے۔ غالب نے شیفتہ کو اپنے اس خط میں، جس کا ذکر اوپر آیا ہے اور جس میں "گلشنِ بے خار" کی تقریظ کی طرف اشارہ ہے، لکھا ہے کہ تپاں کے انتقال کو چار سال گزرے ہیں۔ تقریظ کے ساتھ جو قطعۂ تاریخ ہے، اس کے مصرعِ آخر سے ۱۲۵۱ھ برآمد ہوتا ہے،* اس سے سالِ وفات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سراج کے نام کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو ان کے مرنے کی اطلاع ۱۱ شوال (مطابق ۱۵ مارچ) کو پنجشنبے کے دن ملی تھی۔ ۱۵ مارچ پنجشنبے کو ۱۸۳۲ء میں پڑتی ہے، مگر جنتری میں اس دن ہجری تاریخ ۱۲ شوال دی ہے(۱۱)۔ یہ متیقن ہے کہ ان کی تاریخِ وفات ۱۵ مارچ ۱۸۳۲ء سے چند دن قبل ہے۔

تپاں کے نام ۲۶ خط "متفرقات" میں ہیں(۱۲)۔ "پنج" یا "اردوے معلّٰی" وغیرہ میں

---

* "سبد چین" پر جو مقالہ میں نے "معصنّف" علی گڑھ [شمارہ: ستمبر ۱۹۳۸ء] میں لکھا تھا، اس میں سہواً ۱۲۵۱ کی جگہ ۱۲۴۸ لکھ دیا گیا ہے [اب یہ مقالہ "کچھ غالب کے بارے میں" حصۂ اول میں شامل کر لیا گیا ہے (نقوی)]۔

ان کے نام کا کوئی خط نہیں۔

فیض الدین حیدر عرف حیدرجان کا ذکر "ن" کے بعض خطوط کے سوا غالب کی کسی اور تحریر میں نہیں ملتا۔ "دل کشا" میں مرقوم ہے:

شائق خواجہ حیدر جان بسرِ خواجہ علیم اللہ (کذا) باشندۂ جہانگیر [نگر] شاگردِ غالب:

یوں یہ تنِ خراب بنا اور بگڑ گیا
جیسے کہ بس حباب بنا اور بگڑ گیا

شیشہ گر، کیا ہے بنا تجھ سے جو پتھر شیشہ!
اشک کا اس سے بناتا ہوں میں بہتر شیشہ!

"سراپا سخن" کا مصنف لکھتا ہے:

خواجہ فیض الدین عرف حیدرجان شائق ولد خواجہ خلیل الدین، باشندۂ ڈھاکہ وارد دہلی، شاگرد — غالب۔ (ص ۱۹۷، دو شعر دیے ہیں)

"نگارستانِ سخن"* (۱۳) میں ہے:

خواجہ فیض الدین معروف بہ خواجہ حیدرجان ابنِ خواجہ خلیل اللہ... بست و چہار سال می گزرد کہ ازیں جہانِ گذراں گذشتہ۔ ایں یک شعر ازو رسیدہ:

ہمیں بس بود خوں بہا بعدِ قتلم
بتر با کہ از کشتگانِ منست ایں

"سخن" میں ہے:

---

* یہ تذکرہ میں نے دیکھا ہے، لیکن یہ عبارت "جادو" سے منقول ہے، اس میں سالِ تصنیف ۱۲۸۳ھ لکھا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ ایک سال سے زیادہ میں لکھا گیا ہوگا۔

شائق تخلص، خواجہ فیض الدین عرف خواجہ حیدر جان... ولد خواجہ خلیل اللہ... شاگرد... غالب، شعرِ فارسی و اردو ان کے پرورد ہوتے ہیں، ایک چھوٹا سا دیوان ان کا نظر سے گزرا۔ بارہ تیرہ برس ہوئے کہ فوت کی۔ کلکتے میں بھی آئے تھے۔

"تذکرۂ نُساخ" میں ہے:

... ابنِ خواجہ خلیل اللہ کشمیری... بذریعۂ خط و کتابت اصلاحِ گفتہ ہائے خودش [کذا= خویش] از... غالب... می گرفت۔ بہ ہر دو زبان... اشعارِ بامزہ می گوید۔ دیوانِ ریختہ اش از نظر گذشت۔ بیست و شش سال است... کہ بہ عالمِ جاودانی رفتہ۔

رسالہ "جادو" ڈھاکا (مارچ ۱۹۲۳ء) میں تحت عنوانِ "شعرائے ڈھاکہ" اور شعرا کے ساتھ ان کا [بھی] ترجمہ درج ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ [شائق] خواجگانِ ڈھاکا [کے خاندان کے ایک] "ذی اثر ممبر" خواجہ خلیل اللہ خاں کے فرزند تھے۔ علومِ عربیہ و فارسیہ کی باقاعدہ تحصیل نہ تھی۔ غالب سے بذریعۂ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا تھا۔ غالب نے انھیں طوطیِ بنگال (کذا) کا خطاب دیا تھا۔ آغا احمد علی اور غالب کے معرکے میں بھی شریک تھے مگر اب اس کا کوئی ریکارڈ نہیں (۱۴) ـــــ اصلی نام فیض الدین حیدر ہے جو کبھی اختصار کے بعد فیض الدین ہو جاتا ہے۔ والد کا نام حلیم اللہ نہیں، خلیل اللہ ہے (۱۵) - دہلی جانا غالباً صحیح نہیں (۱۶)، اور غالب سے کلکتے میں ملاقات کا بھی کوئی ثبوت نہیں (۱۷)۔ اس بات کی بھی کوئی سند نہیں کہ غالب نے انھیں کوئی خطاب دیا تھا، یا انھوں نے غالب کی حمایت میں کچھ لکھا تھا۔ سالِ وفات کی تعیین مشکل ہے مگر یہ یقین ہے کہ تیرھویں صدی کے آٹھویں عشرے میں ان کا انتقال ہوا ہے (۱۸)۔ "ن ا" میں ان کے نام صرف ایک خط ہے (۱۹)۔

خواجہ محمد حسن: ظاہراً منشی محمد حسن سے، جن کے نام "پنج" میں متعدد (۲۰) خطوط ہیں اور جن کا ذکر اردو کے ایک خط میں [بھی] ہے ("خطوط"، ص۹۷)، مختلف ہیں۔ خواجہ محمد حسن اور ان کے بھائی خواجہ فخر اللہ کے متعلق "ن ا" میں جو کچھ ہے، اس کے علاوہ فی الحال کچھ نہ معلوم ہو سکا (۲۱)۔

[۴]

"ن ا" میں سراج الدین احمد، ابوالقاسم، مرزا اکبر بیگ، مرزا افضل بیگ، نواب علی اکبر خاں، اسٹرلنگ، آغا محمد حسین، حکیم صادق علی خاں، حکیم سیّد احمد علی خاں، محمد علی، خواجہ مستقیم، راؤ شیو راو(۲۲)، نواب حسام الدین حیدر خاں، محمد محسن، سیّد عالم علی خاں، رحم علی، جانو اور قتیل کے نام آئے ہیں(۲۳)، مگر ان لوگوں کے نام کوئی خط نہیں(۲۴)۔

سراج الدین احمد: غالب کے خاص الخاص دوستوں میں تھے(۲۵)، ("عود"، ص ۱۶۶)۔ عجب نہیں کہ کان پور کے باشندے ہوں۔* ("متفرقات"، ص ۳۵ و ص ۸)، عبدالکریم میر منشیِ دفتر کدۂ فارسی، یا خلیل الدین خاں، یا دونوں سے رشتے داری ہونی بھی دور از قیاس نہیں (۲۶) ("متفرقات"، صفحات: ۱۸، ۲۸، ۳۰، ۳۶، "خطوط"، ص ۳۹۲)۔ جس وقت غالب کلکتے گئے ہیں، یہ اعیانِ دفترِ کونسل سے تھے (خط ۳۲/۲۴)۔ اس کے بعد ابھی تپاں زندہ ہی تھے کہ "یہ زینت بخشِ پیش گاہ صدر عدالت" ہو گئے تھے (خط ۳۲/۲۴)۔ جنابِ مہر کا یہ قول کہ کاروبار کے سلسلے میں مقیم کلکتہ تھے ("غالب"، ص ۱۱۵)، صحیح نہیں (۲۷)۔ "گلِ رعنا" کی ترتیب ان کی تحریک سے ہوئی اور اس کا ذکر اس کے دیباچے میں ہے۔ دیوانِ فارسی میں بھی انھیں یاد کیا ہے:

با سراج الدین احمد چارہ جُز تسلیم نیست
ورنہ غالب می گزد ذوقِ غزل خوانی مرا

[یہ مقطع کی ابتدائی شکل ہے۔ دیوانِ مروّجہ میں مصرعِ آخر میں کچھ تغیر کیا ہے(۲۸)

---

* بعض خطوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ مسکن تھا ("پنج"، ص ۶۲)۔

ان کے نام کے اٹھائیس خط "پنج" میں اور اکیس "متفرقات" میں ہیں۔ ان میں سے گیارہ دونوں میں مشترک ہیں(۲۹)۔ غالب نے اوائلِ ۱۸۵۹ء میں "دستنبو" کا ایک نسخہ انھیں بھجوایا ہے اور ایک خط میں، جو رمضان ۱۲۷۸ھ [مارچ ۱۸۶۲ء] کے کچھ بعد کا لکھا ہوا ہے(۳۰)، ان کے نام کے ساتھ "رحمۃ اللہ علیہ" لکھا ہے("عود"، ص۱۶۶)۔

ابوالقاسم خاں: قاسم کے متعلق عبدالقادر خاں رام پوری اپنے روزنامچے(۳۱) میں لکھتے ہیں* کہ:

عالی خاندانست۔ مولدش شاہجہان آباد است و چندے بہ لکھنؤ بود، آب ودانہ بہ کلکتہ رسانیدہ۔ معاش نہ درخورِ لیاقت داشت۔

(صفحات: ۴۰ و ۴۱)

"دیوانِ جہاں" (نسخۂ کلکتہ) میں ہے کہ خاندانِ شاہی سے کچھ قرابت رکھتے ہیں۔ "نسخۂ دل کشا" کے مصنف کا بیان ہے کہ خاندانِ بادشاہی سے تھے۔ نسّاخ نے انھیں "شہزادہ" لکھا ہے اور تیمور کی اولاد میں بتایا ہے۔("سخن"، ص ۳۰۷)، لیکن شاہ زادہ ہونے کے لیے تیموری ہونا کافی نہیں، اور نہ نسّاخ کے علاوہ کسی نے انھیں "شہزادہ" لکھا ہے۔ غالب سے غالباً کلکتے کی ملاقات تھی۔ غالب کی مدحیہ غزل میں، جس کا ذکر تپاں کے حال میں آیا ہے، ایک شعر ہے:

ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسم و تپاں
ایک تپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

("متفرقات"، ص۱۰۵)

اگر "درد کا یادگار" سے یہ مراد ہے کہ درد کے بےواسطہ شاگرد تھے، تو غالب سے عمر میں بہت بڑے ہوں گے۔ ایک قطعہ قاسم کا بھی غالب کی مدح میں ہے، مگر اس کا تعلق غالب کی شاعری سے نہیں۔ ظاہراً اس کے ساتھ جو خط بھیجا تھا، اس میں یہ بھی تھا کہ کوئی غلطی ہو تو درست کر دیں("متفرقات"، ص۱۱۳)، اور غالب نے اپنے منظوم جواب میں اسلے کی ایک

* کتاب میں نے نہیں دیکھی۔ عبارت آرزو صاحب کے ایک خط سے ماخوذ ہے۔

غلطی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ ظاہرا قاسم ہنری املاک کے متوسلین سے تھے ("متفرقات" ص ۷ و ۳۵)۔

غالب کے خطوں میں ان کی وفات کا ذکر نہیں، لیکن تپاں کی وفات کے کچھ بعد تک زندہ تھے۔ ان کے ایک لڑکے [محمد مرزا] کی وفات کی طرف بھی بعض خطوں میں اشارہ ہے۔ ["متفرقات"، صفحات: ۹۱ و ۹۳] "دل گشا" میں ان کا ذکر اس طرح ہے گویا مر چکے ہیں۔ قرینہ ہے کہ تپاں کی وفات کے کچھ بعد راہیِ عدم ہوئے ہوں گے (۳۲)۔ "پنج" وغیرہ میں ان کے نام کا کوئی خط نہیں۔ "متفرقات" میں بیس خط ہیں، نامۂ منظوم مزید بر آں۔

مرزا اکبر بیگ سے غالب کی حقیقی بہن (۳۳) بیاہی تھیں۔ خط ۱/۲ سے پتا چلتا ہے کہ جس زمانے میں یہ لکھا گیا ہے، یہ بھی کلکتے میں تھے (۳۴)۔ غالب کی کسی اور تحریر میں ان کا ذکر نہیں۔

مرزا افضل بیگ: مرزا اکبر بیگ کے بھائی اور کلکتے میں اکبرِ ثانی کے سفیر تھے۔ غالب کا کوئی خط ان کے نام کا موجود نہیں، لیکن دوسروں کے خطوں میں ان کا ذکر بہت ملتا ہے۔ غالب جب تک کلکتے میں رہے، ظاہرا ان سے کوئی شکایت نہ ہوئی (۳۵)، لیکن واپسی کے بعد لکھا ہے کہ یہ اپنے خواہر زادوں (اولادِ مرزا حاجی) سے رشوت لے کر اُن کے ہم درد ہو گئے ہیں، اور غالب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں ("متفرقات"، ص ۳۹)۔ ان کی وفات تپاں کے انتقال سے پہلے ہوئی اور یہ جس سنہ ہجری میں ہو، صفر کے آخری چہار شنبے سے پہلے تھی (۳۶)، ("متفرقات"، ص ۶۰)۔

نواب علی اکبر خاں: مصنفِ "سیَر المتاخرین" [غلام حسین خاں طباطبائی] کے بھتیجے (۳۷) اور ہوگلی کے امام باڑے کے متولی تھے۔ غالب ان کے پاس محمد علی صدر راہیِ باندہ برادرِ سراج الدین علی خاں قاضی القضاۃ کلکتہ (۳۸) کا خط لے کر گئے تھے اور ان کے بہت مداح ہیں۔ تین بار ہوگلی جانے کا پتا غالب کے خطوں سے ملتا ہے (۳۹)۔ غالب کا

بیان ہے کہ جب کلکتے میں ان پر اعتراض ہوا تو انھوں نے اور محمد محسن نے جواب دیے تھے اور ان دونوں کی تحریک سے [مثنوی] "بادِ مخالف" لکھی تھی ("پنج"، ص ۸۰)۔ شاد [عظیم آبادی] نے اس سلسلے میں "حیاتِ فریاد" میں جو کچھ تحریر کیا ہے، اس کے لیے وہ اپنے تخیل کے رہینِ منت ہیں۔ سالِ وفات کا ابھی تک پتا نہیں چلا۔

اسٹرلنگ کے لیے "غالب" کے صفحات: ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۰ ملاحظہ ہوں (۳۰)۔

آغا محمد حسین: کلکتے میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ خانم صاحب، جن کا ذکر "متفرقات" کے صفحہ ["مت"، ص ۱۰۵] پر ہے، غالباً یہی ہیں۔ قاسم کی طرح یہ بھی ہنری املاک کے متوسلین سے تھے ("متفرقات"، صفحہ؟)، غالب سے کلکتے میں گہرے تعلقات ہو گئے تھے، مگر واپسی کے بعد اندیشہ تھا کہ کہیں افضل بیگ نے انھیں بھی نہ ملا لیا ہو۔ "متفرقات" ص ۹۵، ان کے اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ غالب کا ان کے نام کوئی خط نہیں (۳۱) ۔ یہ اور آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی، جن کے نام کا ایک خط "پنج" میں ہے (ص ۱۲۱)، ایک نہیں۔ علائی کے نام کے خط میں جن آغا محمد حسین شیرازی کا ذکر ہے ("مخطوط"، ص ۳۰۷)، وہ موخرالذکر معلوم ہوتے ہیں۔

حکیم صادق علی خاں: حکیم شریف خاں کے بیٹے اور حکیم محمود خاں کے والد تھے (۳۲)۔ غالب ان سے خوش نہیں (خط ۲۲/۲۲ و "متفرقات" ص ۵۱)۔

حکیم احمد علی خاں: عجب نہیں، یہ حکیم سید احمد علی خاں یکتا (لکھنوی) مصنف "دستور الفصاحت" ہوں (۳۳)۔ ان کا نام "پنج" ص ۶۹ اور ۲۵/۲ میں آیا ہے، اس کے علاوہ کہیں ان کا ذکر نہیں۔

محمد علی: تپاں کے بیٹے تھے اور حامد علی کے چھوٹے بھائی (۳۴)۔ یہ شاعر بھی تھے اور

علی تخلص کرتے تھے۔ "سخن" میں ہے کہ:

مولد و جائے تربیت کلکتہ، اپنے والدِ ماجد سے کسبِ سخن کیا تھا لیکن لکھنؤ میں جا کر... وزیر(۳۵) سے بھی دو چار غزلوں میں اصلاح لی تھی۔ ۱۲۷۶ھ [۶۰-۱۸۵۹ء] میں مدینۂ منورہ کو ہجرت کر گئے... صاحبِ دیوان ہیں۔

"سراپا سخن" میں انھیں شاگردِ وزیر لکھا ہے اور ان کے لکھنؤ جانے کا ذکر کیا ہے(ص ۱۵)۔ تپاں سے کسبِ سخن صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ غالب کلکتے میں تھے کہ ان کی شادی بسم اللہ ہوئی تھی۔ اس کے پانچ چھ سال کے بعد ہی تپاں کی وفات ہوئی۔

خواجہ مستقیم، نواب مہدی علی خاں بہادر، راو شیو راو کے نام خطوط "ن ا" کے سوا اور کہیں نہیں ملے۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ [یہ کون] لوگ ہیں؟(۳۶)

حسام الدین حیدر خاں نامی: غیاث الدین محمد خاں قیامت کے بیٹے، امیر الامرا نجف خاں کے داماد، اردو کے مشہور شاعر سید محمد خاں رند کے علاتی بھائی اور معروف کے بڑے دوست تھے۔ معروف کے دیوانِ دوم کا ایک شعر ہے:

حسام الدین حیدر خاں سے امیدِ وفا مت رکھ\
برنگِ گل وہ جفتہ دوست اے معروف نامی ہے

("معیار"، مئی ۱۹۳۶ء، ص ۱۹۸)

غالب نے "چراغِ دیر" میں انھیں یاد کیا ہے:

چو حرزِ بازوے ایماں نویسم\
حسام الدین حیدر خاں نویسم

("ک"، ص ۸۰)

اس موقع پر فضلِ حق اور امین الدین احمد خاں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان سب کے

متعلق لکھا ہے:

غم بے مہریِ ایں دوستاں سوخت (ص ۸۰)

غالباً اسی مصرع کی بنا پر اور تمام امور سے قطعِ نظر کرتے ہوئے حالی نے نامی کو غالب کا بچپن کا دوست بتایا ہے ("یادگار"، ص ۱۲۰)، بات یہ ہے کہ غالب ایک ایسا لفظ لانا چاہتے تھے جو تینوں پر صادق ہو ورنہ غالب اور نامی میں بزرگانہ خردانہ تعلقات تھے اور غالب کی دوستی نامی کے بیٹوں سے تھی۔ چناں چہ ان کے پسرِ خرد حسین مرزا(۴۷) کو "برادرم" لکھا ہے (خط بنام نامی، "پنج"، ص ۸۷)۔ "پنج" میں نامی کے نام چھ خط ہیں۔ شاہِ اودھ کے نام دو فارسی عرض داشتیں ان کی جانب سے لکھی ہیں(۴۸)، ("پنج"، ص ۵۳ و ص ۵۶)، اور چار فارسی رباعیاں ان کی طرف سے شاہِ اودھ کے لیے نظم کی ہیں ("پنج"، ص ۱۱۵ و "ک"، ص ۵۰۲)۔ ان کے دیوانِ ریختہ کا دیباچہ بھی غالب نے تحریر کیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

در آئینِ سخن بہ نظم گستری نظامی نظم بود۔ ("پنج"، ص ۴۱)

حالاں کہ ان کا کلام کچھ بلند پایہ نہیں۔

میرا قیاس ہے کہ غالب کی تبدیلیٔ عقائد میں نامی اور ان کے بیٹوں سے ربط کا بھی کچھ دخل ہوگا۔ اور عمائدِ اودھ سے تعلقات پیدا کرنے میں ان سے مدد ملی ہوگی۔ نامی کا سالِ وفات ۱۹۳۶ء [کذا = ۱۸۳۶ء] ہے، جیسا کہ ترجمۂ اقتباساتِ "احسن الاخبار"، شائع کردہ جناب حسن نظامی، سے معلوم ہوتا ہے۔

محمد محسن: غالب جس وقت کلکتے گئے ہیں، گورنر جنرل کے فارسی دفتر سے متعلق تھے(۴۹)۔ غالب کا بیان ہے کہ کلکتے میں جب ان پر اعتراض ہوئے تو انھوں نے اور علی اکبر خاں نے جواب دیے تھے اور "بادِ مخالف" ان دونوں کی تحریک سے لکھی گئی تھی ("پنج"، ص ۸۰)۔ لارڈ بنٹنک دہلی آئے تھے تو یہ بھی ہم رکاب تھے اور دو دن غالب کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ بعد کو کرائے کا مکان لیا تھا ("پنج"، ص ۶۳)۔ غالب نے "پنج" میں ان کی معزولی کا بھی ذکر کیا ہے۔ (ص ۶۹، ۷۰)

سید عالم علی خاں: عجلت میں یہ ٹھیک پتا نہ چلا کہ کون ہیں؟ ظاہرا میر عالم بہادر(۵۰) ممدوحِ مرزا علی لطف کے اخلاف سے تھے۔

رحم علی خاں اور جانو: ظاہراً تپاں کے ملازم تھے۔

لارڈ صاحب: جن کے دربار میں غالب شریک ہوئے تھے، لارڈ بنٹنک(۵۱) تھے اور رزیڈنٹ جن کا ذکر آیا ہے، کولبروک(۵۲) تھے۔

[۳]

غالب ۱۲۴۳ھ(۵۳) میں تیسری شعبان کو وارد کلکتہ ہوئے(۵۴)، اور اس بنا پر کہ واپسی میں وہ ۱۲۴۵ھ کی دوسری جمادی اللاولیٰ کو باندہ پہنچ گئے تھے(۵۵)، یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اواخر ربیع الثانی یا اوائلِ جمادی اللاولیٰ میں کلکتے سے رخصت ہوئے ہوں گے(۵۶)۔ "ن" کے کل خطوط، بہ استثنائے خطوط: ۲۱/۲۶، ۲۲/۲۷، ۲۳/۲۲، ۲۴/۳۲، ۲۹/۱۴، ۳۰/۱۲، ۳۱/۱۵ و ۳۲/۱۶، غالب نے کلکتے میں لکھے ہیں۔ اس سے ان کا زمانۂ کتابت ایک حد تک متعین ہو جاتا ہے۔

۱/۲ و ۳/۱۳) تپاں: قریب بہ یقین ہے کہ خط ۱/۲ میں جس شادی کا ذکر ہے، محمد علی کی شادیٔ بسم اللہ ہے جو ظاہراً شعبان میں ہوئی (خط: ۷/۱۲)۔ اس(۵۷) خط کا تعلق خطوط: ۲/۹، ۳/۳ و ۷/۱۲ سے ہے۔ خط: ۱/۲ خط: ۳/۳ [سے] اور خط: ۲/۹ ان دونوں سے مقدم معلوم ہوتا ہے۔ خط: ۷/۱۲ اس سلسلے کا آخری خط ہے۔ یہ فیصلہ مشکل ہے کہ یہ خطوط کس سنہ کے ہیں(۵۸)۔

۲/۹)(۵۹) تپاں: ؟*، (۱/۲، ۳/۳، ۷/۱۲)

۳/۲۹ تپاں: ؟(۶۰)، (۳/۲۴ و ۳۰/۲۶)

۵/۲۱) تپاں: ؟ خط: ۵/۲۱ میں اپنے ملازمین کی کلکتہ و اہلِ کلکتہ سے ناواقفیت کا ذکر کیا ہے، ظاہراً اس زمانے کا ہے جب کلکتے میں بازہ وارد تھے(۶۱)، خط: ۶/۲۳ کا اس سے تعلق ہے۔

۶/۲۳)(۶۲) تپاں: ؟، (۵/۲۱)

۳۴/۷) تپاں: ؟ ادبی نزاع کے آغاز کے بعد کا ہے۔ شوال ۱۲۴۳ھ یا اس

* علامتِ استفہام، مکتوب الیہ کا نام خط کے ساتھ نہیں ہے، جب دی گئی ہے۔

کے کچھ بعد لکھا گیا ہوگا (۶۳)۔ خط: ۳/۲۹ و ۳۶/۳۰ بھی اسی زمانے کے ہیں۔

۸/۲۸) تپاں: ؟ زمانہ؟ (۶۴)

۹/۲۰) (۶۵) تپاں: ؟، (۱۰/۱۱)

۱۰/۱۱) تپاں: ؟ خط: ۱۰/۱۱ ورودِ کلکتہ کے چند ماہ بعد (۶۶) کا ہے، جب غالب کو یہ ہدایت کی جاچکی تھی کہ مقدمہ دہلی میں پیش کریں۔ رزیڈنٹ دہلی کے حالات اسی غرض سے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ خط: ۹/۲۰ اس سے قبل کا ہے۔ اس میں اخبارِ "جامِ جہاں نما" مانگا ہے، اور اس میں اُسے واپس کرتے ہیں۔ رزیڈنٹ کا ذکر دونوں میں ہے۔

۱۱/۵) تپاں: خط: ۱۱/۵ کا تعلق خط: ۳۶ "متفرقات" (ص ۷۸) سے ہے، اور اس زمانے کا ہے جب غالب کلکتے میں تازہ وارد (۶۷) تھے۔

۱۲/۷) تپاں: ؟ خط: ۱/۳ و ۲/۹ سے تعلق (۶۸)۔

۱۳/۴) تپاں: خط: ۱۳/۴ پہلا خط ہے جس میں فیض الدین حیدر کا نام آیا ہے۔ خط: ۱۵/۱۰ میں بھی ان کا ذکر ہے۔ خط: ۲۸/۳۱ جو فیض الدین حیدر کے نام ہے، ۶ صفر ۱۲۴۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ پہلا خط ان کے نام کا معلوم نہیں ہوتا اس لیے ۱۳/۴ کا زمانۂ تحریر لازماً خط: ۲۸/۳۱ سے پہلے ہے (۶۹)۔ خط: ۱۵/۱۰ میں جس خط کے ڈھاکا (جہاں گیر نگر) بھجوانے کی استدعا کی ہے، ممکن ہے، خط: ۲۸/۳۱ ہو (۷۰)۔

۱۴/۱) تپاں: ؟ خط: ۱۴/۱ رمضان ۱۲۴۳ھ یا رمضان ۱۲۴۴ھ کا لکھا ہوا ہے (۷۱)۔ خط: ۱۱/۵ میں جس محفل کا ذکر ہے، وہی ہے جس کی طرف خط: ۱۴/۱ میں اشارہ ہے تو ۱۲۴۳ھ یقینی ہے، اور خط: ۱۱/۵ کا زمانۂ تحریر خط: ۱۴/۱ سے مقدم (۷۲) ہے۔ خط: ۱۹/۱۳ میں دستار مانگی ہے، خط: ۱۴/۱ میں اسی کی رسید ہے تو خط: ۱۹/۱۳ خط: ۱۴/۱ سے پہلے کا ہے۔

۱۵/۱۰) تپاں: ؟ (خط: ۱۳/۴ و ۲۸/۳۱)

۱۶/۲۵) تپاں: ؟ یہ خط اس وقت کا ہے جب کلکتے سے رخصت ہونے والے ہیں (۷۳)۔ خط: ۱۷/۱۷ اس کے بعد کا ہے۔

۱۷/۱۷) تپاں: ؟ یہ خط ظاہرا اس زمانے کا ہے جب غالب کلکتے میں

پا بہ رکاب ہیں (۷۴)۔

۱۸/۶) تپاں: ؟ زمانہ ؟ (۷۵)

۱۹/۱۳) (۷۶) تپاں: ؟ (۱۳/۱)

۲۰/۱۹) تپاں: ؟ زمانہ ؟ (۷۷)

۲۱/۲۶) تپاں: ؟ زمانہ ؟ (۷۸)

۲۲/۲۷) تپاں: ؟ "متفرقات" کا خط: ۲۵ بنام تپاں، صفحہ ۶۴، تاریخ تحریر ۴ ستمبر ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء ہوگی۔ سوخرالذکر زیادہ قرینِ قیاس ہے (۷۹)۔

۲۳/۲۲) تپاں: ؟ (۸۰) "متفرقات" کا خط: ۲۴ بنام تپاں صفحہ ۶۳۔ غالباً مرزا افضل بیگ کی وفات کے بعد لکھا گیا ہے (۸۱)۔

۲۴/۳۲) تپاں: ؟ "متفرقات" کا خط: ۲۳ بنام تپاں، صفحہ ۵۷۔ زمانہ بعدِ وفاتِ مرزا افضل بیگ (۸۲)۔

۲۵/۸) تپاں: ؟ (۸۳) زمانہ ؟ (۸۴) (۵/۲۴ و ۴/۲۹)

۲۶/۳۰) تپاں (۸۵) (۵/۲۴ و ۴/۲۹)

۲۷/۱۸) مکتوب الیہ: ؟ (۸۶) زمانہ ؟ (۸۷)۔

۲۸/۳۱) (۸۸) فیض الدین حیدر: ؟ "ہمیں... ایں۔" اصلاح شدہ شکل میں ان کے نام "نگارستانِ سخن" میں موجود ہے۔ غالب نے "۶ صفر، روزِ تحریر جمعہ" دیا ہے۔ ۱۲۳۵ھ ہونا چاہیے۔

۲۹/۱۴ و ۳۰/۱۲) خواجہ محمد حسن: ؟ خط: ۲۹/۱۴ میں غالباً دیوان کی طرف اشارہ ہے جس کا صراحتاً ذکر ۳۰/۱۲ میں ہے۔ میری رائے میں یہ دونوں خط ۱۰ رمضان ۱۲۳۸ھ کے لگ بھگ لکھے گئے ہیں (۸۹)۔

۳۱/۱۵) خواجہ محمد حسن: خط: ۳۲/۱۶ اور خط: ۳۱/۱۵ کا زمانۂ تحریر ایک معلوم ہوتا ہے (۹۰)۔

۳۲/۱۶) خواجہ فخر اللہ: ۱۰ رمضان ۱۲۳۸ھ۔

[۴]

ذیل میں، خطوط کے متعلق جو امور توجہ طلب ہیں، سلسلے وار درج کیے جاتے ہیں:

۱/۲) "دعوتِ شادی" ہندوستانی فارسی ہے، گو یہ ممکن ہے کہ ایرانیوں نے بھی، جو ہند آئے ہیں، لفظ "شادی" کو اس طرح استعمال کیا ہو(۹۱)۔ مہدی باغ کے متعلق جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی فرماتے ہیں:

> پہلے اس محلے کو کہتے تھے جو رپن اسٹریٹ اور الیٹ روڈ کے درمیان میں واقع ہے۔ اس میں پہلے سربرآوردہ مسلمان شرفا رہتے تھے۔ اِس کے قریب اب تک آغا مہدی اسٹریٹ موجود ہے(۹۲)۔

"ن" میں "پیچتاب" ہے۔ غالب نے "پیچ و تاب" لکھا ہوگا(۹۳)۔ اس خط پر "ن ا" میں ہندسہ نہیں، بعد کے خط پر نمبر ۳ ہے۔

۲/۹) "محافل و مجالس"، "محافل" کے بعد "مجالس" کی ضرورت نہ تھی۔ ع: "صلاحِ ما۔ لخ" نہ معلوم کس کا ہے(۹۴)۔ "اسد" "ن" میں کٹا ہوا ہے مگر یہ عمل حال کا معلوم ہوتا ہے۔

۳/۳) "ن" میں "قدوم" کی جگہ "قدم"۔ "شبِ شادیِ نورِ چشم" ہندوستانی فارسی ہے۔ "بے خبر برخاستم" سے یہ معنی لیے ہیں کہ کسی کو خبر کیے بغیر اٹھ گیا۔ اس کے بعد کا جملہ اس سے میل نہیں کھاتا(۹۵)۔ قیام ہو گئی کے متعلق خط: ۷/۱۲ دیکھا جائے۔ "نیاز" سے پہلے "زیادہ" ہوگا۔

۴/۲۹) یہ خط اہم ہے۔ اس میں کن تین مطلعوں کا ذکر ہے، اس کا پتا نہ چل سکا۔ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلع مکتوب الیہ (تپاں) نے بھیجے تھے، مگر کہیں اور اس کا ذکر نہیں۔ "معترض" کی جگہ "معترض الیہ"(۹۶) چاہیے۔

۵/۲۱) "ایک کہار اور دو خدمت گار" ظاہراً دہلی سے ساتھ گئے تھے۔ "کوڑک کہار" ان کے علاوہ معلوم ہوتا ہے(۹۷)۔ "ن" میں "تصدیعہ" (۹۸) ہے۔ "اٹاثال" یقیناً "اٹاثال" (۹۹) ہے۔ عوام اب تک اسے "اٹاثال" ہی کہتے ہیں اور یہاں سال بھر میں ایک بار میلا بھی ہوتا ہے(ص)۔ "اٹاثال" نام کا ڈاک گھر بھی کلکتے میں ہے، وہاں کا مشہور علاقہ ہے۔ "تبر روز آدم"، "ن" میں "ہر روزہ آدم" مگر وہ مشکوک۔

۶/۲۳) تپاں غالب کے خطوط کو اپنی بیاض میں نقل کر لیا کرتے تھے۔ جس خط کو ضائع کرنے اور اپنی بیاض میں نقل کرنے کی ہدایت کی ہے وہ خط: ۲۴ تو نہیں؟

۲۴/۱) یہ خط مجموعۂ ڈھاکا کے تمام خطوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفینِ غالب نے غالب پر اپنے اعتراضات کو قلم بند بھی کر لیا تھا، گو اس کا پتا نہیں چلتا کہ یہ اعتراضات کسی اخبار میں، یا رسالے کے طور پر، چھپے بھی تھے یا نہیں۔ جن اشعار پر اعتراض ہوئے ہیں، وہ کلیات میں موجود ہیں (ص ۳۹۸ و ص ۳۸۳)، اور اسی طرح ہیں جیسا غالب نے بیان کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی میں وجودِ "ذال" سے متعلق غالب کے جس مسلک کا "قاطع" سے علم ہوتا ہے، وہ بہت قدیم ہے۔ ۱۲۴۳ھ (۱۰۰) میں بھی ان کا وہی عقیدہ تھا جو ۱۲۷۶ھ میں تھا۔ یہ بحث طویل ہے کہ فارسی میں "ذال" ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں کبھی آئندہ لکھا جائے گا(۱۰۱)، اس وقت اس امر پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ "پذیرفتن" وغیرہ کو "زے" سے لکھنا قطعاً صحیح نہیں۔ غالب کا یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ چوں کہ وہ اس سے واقف ہیں کہ اور لوگ "پذیرفتن" وغیرہ کو "ذال" سے لکھتے ہیں، "زے" سے لکھنا املا کی غلطی نہیں(۱۰۲)۔ "غلطی" کی "یا" زائد ہے۔ غالب نے اردو میں بھی لکھا ہے:

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ (۱۰۳)

میں فی الحال یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ ایرانیوں نے "غلط" کو یاے زائد کے ساتھ استعمال کیا ہے یا نہیں۔ اس خط کے متعلق "مؤید" میں ہے:

پیش ازیں، بہ دو سال تخمیناً، رقعاتے چند نوک ریز خامۂ حرف آفرین

جنابِ غالب بہ نظرِ فقیر آمد۔ نقلِ یک رقعہ از اں این کہ۔۔۔

اس کے بعد (یہ) خط نقل کیا ہے جس میں "لیکن ازاں جا۔۔ غلط نخوانند" اور "اگر نیز زند۔۔ اسد اللہ" کے سوا کل عبارت موجود ہے (ص ۱۷۷ و ص ۱۷۸)۔ احمد کے سامنے پورا خط تھا اور انھوں نے عبارتیں خود حذف کر دیں، یا نامکمل خط تھا جو سارے کا سارا نقل کر دیا ہے، اس کا فیصلہ مشکل ہے۔

۸/۲۸) "ن" "پیچ و تشویش" "پیچ و تابِ تشویش" ہوگا۔

۹/۲۰) لال ڈگی ۔۔ اب بھی ڈلہوزی اسکوائر کے اس حصے کو کہتے ہیں جو جنرل پوسٹ آفس کے قریب واقع ہے (ص)، "ن" میں رزیڈنٹ (۱۰۴)۔

۱۰/۱۱) "جامِ جہاں نما" کلکتے کا اخبار تھا (۱۰۵)۔ اس کے متعلق ایک مقالہ "ہندستانی" (۱۰۶)، الہ آباد، میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے تحریر فرمایا ہے (۱۰۷)۔ "ن" میں "رزیڈنڈ" (۱۰۸) ہے۔ اس خط سے ثابت ہے کہ "گلِ رعنا" کی ترتیب کلکتے ہی میں ہو گئی تھی (۱۰۹)۔

۱۱/۵) گورنر جنرل سے تنہائی میں نہیں، دربارِ عام میں ملاقات کا ذکر ہے۔ شب کو سراج کے یہاں ٹھہرے تھے ("متفرقات"، ص ۸۷)۔ "دوشالہ" ہندی فارسی ہے۔

۱۲/۷) قیامِ ہوگلی کے متعلق خط: ۱۳/۲ ملاحظہ ہو (۱۱۰)۔

۱۳/۱) حکیم صاحب: ممکن ہے کہ حکیم سید احمد علی خاں ہوں (۱۱۱)۔ "استمعار" کے معنی استفسار نہیں۔ یہ کاتب، یا غالب، کی غلطی ہے (۱۱۲)۔ "سرِ قدم" کے بعد "ساختن" کاتب سے چھوٹ گیا ہے۔ "سولیت" کی جگہ "سولت" ہونا چاہیے (۱۱۳)۔ مکتوب الیہ سے قرض مانگا ہے، مدعا یہ ہے کہ رقم مطلوبہ یک مشت مل جائے۔ اس خط پر "ن" میں ہندسہ نہیں۔

۱۶/۲۵) خط: ۱۷/۱ میں دوشنبے کے دن کلکتے سے روانگی کا ذکر کیا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجشنبے کو کلکتے سے رخصت ہونے والے تھے۔

۱۷/۱۷) اس سے ظاہر ہے کہ جوانی میں بھی شب کا کھانا نہ کھاتے تھے (۱۱۴)۔ یہ بات نئی ہے کہ اتوار کے دن "اکلِ لحم" سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ پتا نہیں کہ یہ عارضی بات

تھی یا ہمیشہ کا دستور تھا۔ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوشنبے کے دن کلکتے سے رخصت ہونے والے تھے(۱۱۵)۔

۲۰/۱۹) "برجو تالاب": یہ تالاب اب تک موجود ہے۔ کلکتہ کلب اور سینٹ پال کیتھڈرل کے درمیان میں واقع ہے(ص)۔ "ولاماندگی پاے" اور استغناے" کی جگہ "ن" میں "ولاماندگی پاہ" اور استغناء۔"

۲۱/۲۶) "فرزندانِ ارجمنداں": صفت کی جمع لانے پر غالب معترض ہوئے ہیں(۱۱۶)، (تفاصیل: "محقق")۔

۲۲/۲۷) "تنت... گزند مباد" حافظ کا مطلع ہے۔ "چندم" اب تک کہیں میری نظر سے نہیں گزرا(۱۱۷)۔ یہ خط "متفرقات" میں بھی ہے(ص ۹۸)۔

اختلافات: "متفرقات" میں "صادق علی خاں" کے بعد "صاحب"، "رسیده است" کی جگہ "رسید"، "قبلۂ نیکواں" کی جگہ "قبلۂ صورت و معنی"، "احمد" کے بعد "صاحب"، "طرازور قم" کی جگہ "طرازِ حرف و رقم"، "قبلۂ صورت و معنی" کی جگہ "قبلۂ نیکواں"، "حکیم احمد علی خاں" کی جگہ "حکیم صادق علی خاں" (اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے)، "عزمِ انقطاعِ علاقہ" کی جگہ "عزمِ انفکاکِ سررشتہ" ہے۔ "متفرقات" میں "دریابم" کے بعد یہ عبارت زائد ہے:

> حالے کہ دارم ازرُوے عریضۂ(۱۱۸) موسومۂ جناب مولوی سراج الدین احمد صاحب سمتِ انکشاف توانید یافت۔ بخدمتِ قدوۂ معظم کورنش و

اور "عزیزازجان" کی جگہ "عزیزازجاناں" اور "وافزونیِ دولت" کی جگہ "فقط"(۱۱۹)۔

۲۳/۲۲) یہ خط "متفرقات" میں بھی ہے(ص ۶۳، ۶۴)۔

اختلافات یہ ہیں: "متفرقات" میں "قبلہ" کی جگہ "کعبہ"، "گویم" کی جگہ "گوئید" (اور یہی صحیح ہے)، "ترسند" کی جگہ "ترسند" (یہ قابلِ ترجیح) "فداے" کی جگہ "فدا"، "مدعا این ست" کی جگہ "مدعا این"، "جملہ" کی جگہ "جملہ را" (یہی صحیح ہے)، "دیار دارید" کی جگہ "دیار است"، "مخوش" کی جگہ "خوش"، "گروه، یعنی حکما" کی جگہ "گروه"، "ازحالِ قدومی..."

خاکسار است" یہ تمام عبارت خفیف اختلاف کے ساتھ "متفرقات" میں سراج کے نام کے ایک خط کا جزو ہے (ص ۵۰)۔ "متفرقات" میں "خاں" کے بعد "بہادر"، "سراسیمگی" کے بعد "ہا"۔

۳۲/۲۴) یہ خط "متفرقات" میں بھی ہے (ص ۵۷، ۵۸)۔

اختلافات: "متفرقات" میں "اندہ" کی جگہ "اندوہ"، "کہ سر برود" کی جگہ "کہ اگر سر برود"، "بوید" کی جگہ "بوند"، "معنی" کی جگہ "یعنی"، لفظ "فقط" "متفرقات" میں نہیں۔ "یاد آرند" کے بعد بہت سی عبارت ہے جو "ن" میں نہیں۔

۳۰/۲۶) شسلہ بازار: غالب نے لکھا ہے کہ چیت بازار کے قریب ہے (۱۳۰) ("ہنج" ص ۷۵)۔ "غالب" میں ہے کہ چیت پور روڈ کے اس حصے میں تھا جو بعد کو "گونڈا تالاب" کے نام سے مشہور ہوا (ص ۱۰۸)۔ "آوازِ... گدارا" سنا ہوا مصرع ہے، مگر یاد نہیں آتا کہ کس کا ہے (۱۳۱)۔ اردو شعر دیوانِ مروجہ میں ہے۔ اس خط سے بھی ادبی نزاع پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۸/۲۷) "باہمہ... مرا" کلیات میں ہے (ص ۳۴۰)۔ مکتوب الیہ ظاہرا کلکتے سے ڈھاکا (جہاں گیر نگر) جا رہا تھا (۱۳۲)۔ دردِ سر کی وجہ سے غالب سے رخصت نہ ہو سکا۔ یہ خط ڈھاکا بھیجا گیا ہے۔

۳۱/۲۸) مجھے یاد آتا ہے کہ حکیم حبیب الرحمان مرحوم نے حاشیۂ "ن" پر لکھا تھا کہ جو اشعار اس خط میں ہیں وہ شائق کے دیوان میں موجود ہیں۔ اس خط میں "اجلۂ بدیہات" آیا ہے، اس کی نسبت احمد لکھتے ہیں:

> من یکے از ثقات سماع دارم کہ جنابِ غالب در یکے از نامہاے خود "اجلۂ بدیہیات" نگاشتہ است و "اجلاے بدیہیات" کہ زبان زدِ خاص و عام است، آں را نارو اپنداشتہ است۔ ("مؤید"، ص ۳۷۳)

جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ "اجلِ بدیہیات" ہونا چاہیے۔ "اجلۂ" اور "بدیہات" دونوں غلط ہیں (۱۳۳)۔

۱۴/۲۹) اس خط پر "ن" میں ہندسہ نہیں۔ ظاہرا کاتب "ن" کے نزدیک خط: ۱۳/۱۹ (۱۳۴) کا جزو ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، یہ جداگانہ خط ہے۔

(۳۰/۱۴) گورگانواں کے راستے سے جانے اور اس بنا پر حسام الدین حیدر خاں سے دیوان لینے [میں] کیا تعلق ہے، خط سے ظاہر نہیں (۱۲۵)۔ یہ بھی پتا نہیں کہ دیوانِ اردو یا دیوانِ فارسی کا ذکر ہے۔ اگر فارسی ہے اور یہ خط اس زمانے کا ہے جب خط ۳۱/۱۵ لکھا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دیوان ۱۲۴۸ھ میں مرتب تھا (۱۲۶)۔

(۳۱/۱۵) "مزہ بے مزہ"؟ "کوائف" اردو میں بولتے ہیں، عربی میں غلط ہے، فارسی کے متعلق اس وقت کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ "لکھنو" "ن" میں "لکنو" (۱۲۷)، "دولت ہائے مستقبلہ"؟ (۱۲۸) "ضروری العرض" کی جگہ "واجب العرض" چاہیے۔ "فروغ" کی جگہ "ن" میں "فرغ۔" اس خط کے ساتھ مکتوب الیہ کی طرف سے جو خط غالب نے لکھا ہے، وہ کس کے نام ہے؟ اس مکتوب الیہ کا حیدر آباد سے تو کچھ تعلق نہیں؟ (۱۲۹)

(۳۲/۱۶) اس خط سے ظاہر ہے کہ غالب حیدر آباد، یا کسی اور ریاست، سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں (۱۳۰)۔ "غالب... زیستن" کلیات میں ہے (ص ۴۷۵)۔ "سیدِ عالم" و "قبلۂ اہلِ عالم" سے ظاہراً نواب سید عالم علی خاں مراد ہیں۔ صنعتِ تعطیل میں جس نثر کا ذکر ہے، وہی ہوگی جو معتمد الدولہ کی مدح میں لکھی گئی تھی۔ اور "پنج" میں موجود ہے (۱۳۱)، (ص ۳۲)۔ "رفعات ورجت"؟ (۱۳۲)

التماس

(۱) کتاب کا نام پہلے "آثارِ غالب" رکھا گیا تھا، یہ معلوم ہوا کہ اس نام کی اور ایک کتاب موجود ہے تو نام بدل دیا گیا۔ کتاب میں جہاں "آثارِ غالب" نظر آئے، اسے "تآثرِ غالب" سمجھا جائے۔

(۲) اغلاطِ طباعت بہت ہیں۔ غلط نامہ اس لیے شامل نہیں کیا جاتا کہ اس کے صحیح چھپنے کا امکان زیادہ نہیں۔

(۳) صفحہ ۴۴، سطر ۸ [موجودہ صفحہ ۹۱، سطر ۱۷]: تحریرِ حواشی کے بعد "فیضِ صفیر" کی اشاعتِ اول نظر سے گزری۔ اس میں میر ولادت علی کے نام کا خط شامل نہیں۔

(۴) صفحہ ۴۴، سطر ۱۸ تا ۲۳ [موجودہ صفحہ ۹۲، سطر ۷ تا ۱۲]: "جلوۂ خضر" جلد ۲ کے علاوہ "مرقعِ فیض" میں بھی غالب کے چند خطوط ہیں جن کے مکتوب الیہ صفیر ہیں۔ ان میں سے ایک خط میں، جو ۸ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ کا ہے، یہ عبارت ہے:

بوستانِ خیال کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک۔

ایک اور خط، مکتوبہ ۲۱ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ*، میں ہے:

پہلی جلد جس کا نام "افق الخیال" ہے، اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں۔ جناب میر ولادت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو، بے طلب بھیج دیں اور معاً قیمت لکھ بھیجیں۔

غالب کا کوئی خط ایسا طبع نہیں ہوا جس میں خود صفیر کو قیمت بھیجنے کا ذکر ہو۔ میرا خیال، کہ صرف ایک جلد چھپی تھی، غلط نکلا۔

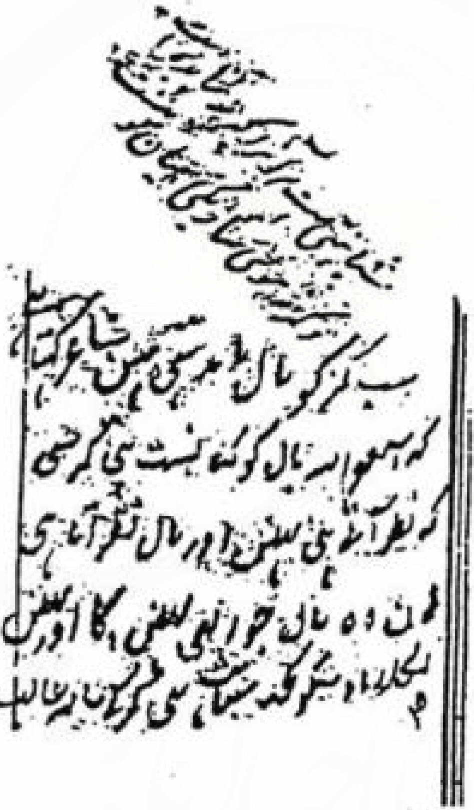
(۵) صفحہ ۴۹، سطر ۱۹ [موجودہ صفحہ ۹۸ سطر ۱۶]: ابنِ حجر کی کتاب کا نام "تنبیہات" ہے۔

(۶) صفحہ ۶۰، سطر ۱۶ [موجودہ صفحہ ۱۱۴، سطر ۹]: علی اکبر خاں صاحبِ "سیر المتاخرین" کے حقیقی بھتیجے تھے اور مہدی علی خاں سو مخرالذکر کے ایک پوتے کا نام تھا۔ عجب نہیں، غالب کے خط میں انھیں کا ذکر ہو۔

(ق ع و)

ایک شعر کی شرح غالب کے قلم سے (کلیات ورق ۱۰۱ الف ۹۳ ص ۱۰۱)

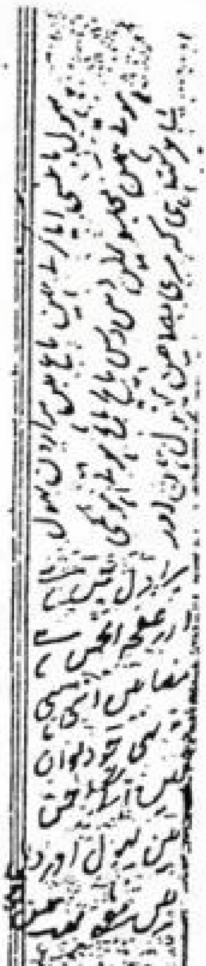
(بعد از سنہ ۱۲۵۴ ہجری)



عطیہ خان صاحب قاسم حسن صاحب

کتب خانۂ خدا بخش، پٹنہ

کلیات کے ایک نسخے پر غالب کا حاشیہ (ورق ۹۶ ب، ۵۹۴ ۱۴۸)
(بعد از سنہ ۱۲۵۴ ہجری)



عطیہ خاں صاحب قاسم حسن صاحب
کتب خانۂ خدا بخش، پٹنہ

— مآثر غالب (غالب کی نایاب نظم و نثر کا مجموعہ) مرتبۂ قاضی عبدالودود۔ یہ کتاب بنام "آثار غالب" علیگڑھ میگزین کے غالب نمبر سنہ ۱۹ء میں شامل تھی بعد کو اس کا علم ہوا تو وہ نسخے جو الگ کر چھپے تھے مآثر غالب کے نام سے شائع ہوئے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مآثر میں ایک سرورق زیادہ ہے اور کچھ ضروری مطالب بعنوان التماس کا اضافہ ہے۔ ص ۶۸ — عرض حال (ایک صفحہ) کے بعد حصۂ اول ص ۱ تا ص ۱۳ [illegible] اردو نثر: دیباچۂ لطائف غیبی، دیباچۂ تیغ تیز، ایک استفتا (ماخوذ از تیغ)، خط بنام میر ولایت علی [illegible] مکتوبوں کے مطالب مع عکس (ماخوذ از حواشی کلیات نظم فارسی سنہ ۱۲[illegible]) اردو نظم: اشتہار پنج آہنگ (ماخوذ از اسعد الاخبار) غزل (ماخوذ از دیوان [illegible])، ہجو سعادت علی (۳ ابیات، ماخوذ از لطائف)، فردیات (ایک ماخوذ از [illegible]، ایک ماخوذ از لطائف۔ فارسی نثر: تقریظ قاطع برہان (۱۵)، تقریظ [illegible] و مآثر [illegible]۔ فارسی نظم: نامۂ منظوم بنام [illegible] (کلیات [illegible] سے ماخوذ)، ۳ شعر (رباعی (ماخوذ از [illegible])، فردیات فارسی (ایک ماخوذ از لطائف، ایک ماخوذ از تذکرۂ [illegible]) — حصۂ ۲ ص ۱۷ تا ص ۳۴ — مخطوطۂ فارسی ۳۳ [illegible] بنام [illegible] ۳۶ [illegible] (اس میں ایک [illegible]) بنام [illegible]، مکتوب الیہ نامعلوم — مرزا [illegible] مکتوب الیہ کا نام [illegible] کی بنا پر [illegible] باقی معلومات [illegible] — ص ۶۵ : حکیم حبیب الرحمٰن [illegible] کے پاس ایک مجموعہ تھا جس کی نقل [illegible] کی تھی۔ مآثر کے ۳۳ خطوط فارسی اسی مجموعے میں ہیں۔ اس میں [illegible] ایک خط جو پنج [illegible] (کلیات [illegible]) میں ہے، خاتمۂ گل رعنا [illegible]، اور [illegible] کی اولین روایت (د) بھی موجود ہیں۔ مآثر میں [illegible] وقت ترتیب مجموعے سے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ [illegible] کتاب درج نہیں۔ کاتب [illegible] نہیں، [illegible] بالجملہ [illegible] (۳ جگہ)، [illegible] صحیح [illegible] غالب کا پیرو [illegible] غالب ہی [illegible] حکیم صاحب نے اپنے ایک خط میں [illegible] کا مجموعہ [illegible] اس کا [illegible] تحریر کے [illegible] ان میں سے [illegible] — اسی کے ساتھ مکاتیب [illegible] ایک مجموعہ ہے [illegible] غالب کا [illegible] ص ۶۸ میں ہے کہ اس مجموعے کے ایک خط [illegible] — اس میں ایک [illegible] اغلاط بہت ہیں، [illegible] کا امکان زیادہ نہیں۔

• مآثر غالب کے بارے میں جناب قاضی عبدالودود کی ایک تحریر کا عکس

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار

مآثرِ غالب

(غالب کی کمیاب نظم و نثر کا مجموعہ)

مرتبہ

قاضی عبدالودود

طبع اول ستمبر ۱۹۴۹ء

زندہ دارد مرد را آثار مرد
بوئے گل باقیست چوں گردد گلاب
(نظیری)

آثارِ غالب

مرتبہ

قاضی عبدالودود

حواشیِ "آثارِ غالب"

از

ڈاکٹر حنیف نقوی

ان حواشی میں مندرجہ ذیل رموز استعمال کیے گئے ہیں:

"باغ" = "باغِ دودر"، مرتبہ ڈاکٹر سید وزیرالحسن عابدی

"بزم" = "بزمِ غالب" از عبدالرؤف عروج

"رسائل" = "قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ"

"سفرنگ" = "سفرنگِ دساتیر"

"ص" = صدیقی، ڈاکٹر محمد زبیر

"ما" = "مآثرِ غالب" [طبعِ اول]

"گل" = "انشائے سیدِ گل" از سید محمد ہاشم، مطبوعہ آرہ، ۱۳۸۹ھ

"ت" = "متفرقاتِ غالب" [طبعِ ثانی]

"نامہ" = "نامہ ہائے فارسیِ غالب"، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی

* "غالب اور صفیر بلگرامی" میں "مرقعِ فیض" اور "جلوۂ خضر" کے حوالے سے اس خط کی تاریخِ تحریر شنبہ ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ ہجری بتائی گئی ہے (حاشیہ، ص ۷۹)۔ [حنیف نقوی]

حصۂ اوّل

(۱) "ط" = اختیار کر کے۔

(۲) "رسائل" = سعزز۔

(۳) "ط" = "نہ" ندارد۔

(۴) "ط" = "گاؤں"، یہ معلوم ہے کہ غالب اس طرح نہیں لکھتے تھے۔

(۵) "رسائل" = "ملا" ندارد۔

(۶) "رسائل" = شپیر۔

(۷) یہ شعر شیخ سعدی کے ایک قطعے سے ماخوذ ہے۔

(۸) "ط" = "وہ" ندارد۔

(۹) "ط" = سنگ۔

(۱۰) "ط" = "بھی" ندارد۔

(۱۱) "ط" = عمل۔

(۱۲) "ط" = لکھا۔

(۱۳) "رسائل" = کولی۔

(۱۴) "ط" و "رسائل" = "غلط ساز"، لیکن یہ صریحاً سہوِ قلم ہے۔

(۱۵) "رسائل" = "ہندُستانی"، کاتب نے اس استفتا میں سوال نمبر:۱ کے تحت "ہندُستانی" اور سوال نمبر:۱۳ کے تحت "ہندُستان" اور سوال نمبر:۱ کے جواب میں "ہندستانی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا خیال ہے کہ یہ املا اصل کے مطابق ہے، یعنی غالب نے یہ دونوں لفظ اپنے سوال نامے میں بغیر "واو" کے لکھے ہوں گے اور شیفتہ نے اپنے جواب میں "ہندوستان" ("واو" کے ساتھ) لکھا ہوگا (مکتوب بنام مولانا امتیاز علی عرشی، مؤرخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۳ء، "نقوش" لاہور، خطوط نمبر، حصۂ سوم، ص ۲۳)۔

(۱۶) "ط" = میں "پیدائی" اور "زیبائی" کو "ہمزہ" کے ساتھ اور "پیدایش" و

"زیبایش" کو "یے" کے ساتھ لکھا گیا ہے جب کہ "رسائل" میں یہ چاروں لفظ "یے" سے لکھے گئے ہیں۔ مرتب کے نزدیک ان سبھی لفظوں کو ان کے رائج تلفظ کے مطابق "ہمزہ" سے لکھا جانا چاہیے۔

(۱۷) "طا" = زُندو کند۔

(۱۸) "رسائل" = "کوئی" ندارد۔

(۱۹) "طا" = "ماضی" ندارد۔

(۲۰) "طا" = آہنگیدن۔

(۲۱) "طا" = گراناں

(۲۲) "رسائل" = ہندُستان۔

(۲۳) "رسائل" = مغنیوں۔

(۲۴) "طا" = "مصطفیٰ" ندارد۔

(۲۵) "رسائل" = گورنمنٹ۔

(۲۶) "طا" = "ہر" ندارد۔

(۲۷) "نقوش"، مکتوب عبدالستار صدیقی = ہندستان۔

(۲۸) "گل" = "مہتمم مطبعِ عظیم المطابع، عظیم آباد" ندارد۔

(۲۹) "گل" = اور حقیقت میں۔

(۳۰) "طا" = معلوم۔

(۳۱) "گل" = کل آپ کو خط لکھا۔

(۳۲) "گل" = کھولا تو ٹکٹ۔

(۳۳) "گل" = خدا کرے کہ پہنچ جائیں۔

(۳۴) "طا" = ۱۶ اپریل ۱۸۶۵ء، "گل" = ۹ ذیقعدہ۔

(۳۵) "گل" = غالب بیگرنگ، "نجات کا طالب" ندارد۔

(۳۶) "طا" = پھول ہوتے ہیں۔

(۳۷) "طا" = "ہے" ندارد۔

(۳۸) قاضی صاحب نے یہ غزل قبلاً رسالہ "معیار" (۱۹۳۶ء) میں شائع کی تو اس میں سات شعر تھے۔ تاثر میں نقل ہوتے وقت مقطع سے پہلے والا شعر رہ گیا تھا جو آب نقل کر دیا گیا ہے ("معیار"، ص ۹۵، خدا بخش لائبریری ایڈیشن)۔

(۳۹) "ط" = پاؤں۔ غالب کے نزدیک اس کا صحیح املا "پانو" ہی ہے، چناں چہ دیوان میں یہ غزل ردیفِ واو میں شامل ہے۔

(۴۰) "ط" = "خود" ندارد۔

(۴۱) "باغ" = بہ۔

(۴۲) "ط" = "بہ" ندارد۔

(۴۳) "ط" = منطبع۔

(۴۴) "ط" = آں۔

(۴۵) "ط" = منطبع۔

(۴۶) "ط" = کالبد۔

(۴۷) "ط" = خامہ۔

(۴۸) "ط" = اوست۔

(۴۹) "ط" = ناخن۔

(۵۰) "ط" و "باغ" = سنہ ندارد۔

(۵۱) "ط" = گو۔

(۵۲) "سبز رنگ" = مبداء فیاض۔

(۵۳) "ط" = نابا ے۔

(۵۴) "باغ" = پاش۔

(۵۵) "ط" = آرزو۔

(۵۶) "ط" = بازگشا۔

(۵۷) "ط" = "دانایاں" ندارد۔

(۵۸) "باغ" = بشگفتی۔

(۵۹) "ط" = فرود۔

(۶۰) "ط" = ہر چند کہ۔

(۶۱) "بارغ" = "نادانستہ ستودن" را با "ناستودن" (اصل: "بانا ستودن" ندارد)

(۶۲) "سفرنگ" و "ط" = وگر۔

(۶۳) "بارغ" = اگر بسر ذکر است۔

(۶۴) "بارغ" = سخن۔

(۶۵) "ط" = "درمدح ہم سخنے" ندارد۔

(۶۶) "ط" = زباں زباں۔

(۶۷) "ط" = پروری۔

(۶۸) "ط" = پایہ۔

(۶۹) "بارغ" = "خاں" ندارد۔

(۷۰) "ط" = رواں۔

(۷۱) "ط" = "بیش" ندارد "بارغ" (اصل) = پیش

(۷۲) "ط" = سرائے۔

(۷۳) "ط" = خامہ۔

(۷۴) "سفرنگ" = پدیداراں۔

(۷۵) "ط" = بہ۔

(۷۶) "ط" = زہار۔

(۷۷) "ط" = سُود مندے۔

(۷۸) "بارغ" = گروہ ہائے مردم۔ پاورق میں بحوالۂ اصل، گروہاہ۔

(۷۹) "ط" = زباں داں۔

(۸۰) "ط" = آورد۔

(۸۱) "ط" = آورد۔

(۸۲) "ط" = پارسی۔

(۸۳) "طا" = "را" ندارد۔

(۸۴) "طا" = سپش۔

(۸۵) "باغ" = "ساقی" ندارد۔

(۸۶) "طا" = خوش۔

(۸۷) "طا" = "کہ" ندارد۔

(۸۸) "باغ" = ستانے۔

(۸۹) "طا" = نباشد۔

(۹۰) "باغ" میں مصرعوں کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔

(۹۱) "طا" = چناں۔

(۹۲) "طا" = دریں۔

(۹۳) "طا" = تماشا سنجی۔

(۹۴) "طا" = از۔

(۹۵) "باغ" = بہ آب۔

(۹۶) "طا" = گرو۔

(۹۷) "طا" = چناں۔

(۹۸) "طا" = دل بہ دل خوں۔

(۹۹) "باغ" میں اس شعر کے بعد یہ دو شعر زائد ہیں:

بیا، تا ببینی کہ از روزگار
کنونم بجائے رسیدست کار

کہ می نوشم از خستگی، نز ورع
بہ جائے مےٴ ناب، ماء القرع

(۱۰۰) "طا" = کمال۔

(۱۰۱) "طا" = گل مقام۔

(۱۰۲) "طا" = نہفتند۔

حصّہ دوم

(۱) مقتضائے حال کے مطابق یہاں "می خواہم" ہونا چاہیے۔

(۲) "ط" = اثر۔

(۳) "نامہ" کے مطابق:

دو روز و یک شب صحبت ماند۔ (ص ۴۷)

یہی صحیح بھی ہے کیوں کہ:

پگاہ برخاستم و بہ ہوگلی رفتم

اور:

آخر روز بہ کاشانہ باز آمدم

کے پیشِ نظر دو راتیں ہوگلی میں گزارنا ممکن نہیں۔

(۴) "ط" = معرض۔

(۵) محمد علی کے چھوٹے بھائی کا نام حامد علی تھا (مکتوب بنام سراج الدین احمد، "پنج آہنگ"، طبع: ۱۸۵۳ء، ص ۳۰۷)۔

(۶) "ط" = رزیڈنٹ (مطابقِ "ن ا")۔ غالب اپنی تحریروں میں ہمیشہ "رزیدنڈ" لکھتے تھے۔

(۷) "ط" = وقت۔

(۸) "ط" = زیست۔

(۹) "ط" = بہ آں کہ۔

(۱۰) "ط" = خواہد خواست۔

(۱۱) "ط" = (کذا)

(۱۲) "ط" = نماید۔

(۱۳) "ط" = چیز خوردہ۔

(۱۴) "ت" = نتواں گزارد و دانم۔

(۱۵) "ت" = محرم۔

(۱۶) "ط" = واز۔

(۱۷) "ط" و "ت" = کام وزباں۔

(۱۸) اضافہ از "ت۔"

(۱۹) "ت" = رُوسیاہاں۔

(۲۰) "ت" = بسیار بماند۔ "ت" میں اس کے بعد سولہ (۱۶) سطروں کے بقدر عبارت زیادہ ہے۔

(۲۱) اضافہ از "ت۔"

(۲۲) "ت" = ارجمند۔

(۲۳) "ت" = دعاہا۔

(۲۴) "ت" = صادق علی خاں صاحب بہ من رسید۔

(۲۵) "ط" = چندپا، "ت" = چندم۔

(۲۶) "ت" = قبلۂ صورت و معنی مولانا سراج الدین احمد صاحب۔

(۲۷) "و" اضافہ از "ت۔"

(۲۸) "حرف" اضافہ از "ت۔"

(۲۹) "ت" = قبلۂ نیکواں حضرت سید احمد علی خاں۔

(۳۰) "ت" = بہم داد۔

(۳۱) "ط" = رفاقت۔

(۳۲) "ط" = احمد علی خاں، "ت" = صادق علی خاں۔

(۳۳) "ت" = انفکاک۔

(۳۴) "ت" = سررشتہ۔

(۳۵) "ت" = واللہ اکبر۔

(۳۶) "ت" میں اس کے بعد یہ ایک جملہ زائد ہے:

حالے کہ دارم از رُوے عرضۂ موسومہ جناب مولوی سراج

الدین احمد صاحب ست انکشاف تواند یافت۔

(۳۷) "طا" = جاں۔ "ست" = جاناں۔

(۳۸) "ست" = بہ خدمتِ قدوہ معظمہ کورنش و بہ عزیز از جاناں دعاے طولِ عمر وافزونیٔ دولت۔

(۳۹) "ست" = "سقروں باد فقط" ندارد۔

(۴۰) "ست" = کعبۂ من۔

(۴۱) "ست"، "طا" = گوئیم۔

(۴۲) "ست"، "طا" = بر سر۔

(۴۳) "ست" = می رسند۔

(۴۴) "ست" = بلکہ۔

(۴۵) اضافہ از "ست۔"

(۴۶) "ست" = خدارا۔

(۴۷) "ست" = "مرد" ندارد۔

(۴۸) "ست" = و

(۴۹) "ست" = ایں۔

(۵۰) "ست" = "یعنی حکما" ندارد۔

(۵۱) اضافہ از "ست۔"

(۵۲) "ست" = اگر شمارا عزمِ رسیدنِ ایں دیار است، خوش باشید۔

(۵۳) "ست" = رای العین۔

(۵۴) "ست" میں یہ خط:

بہ رای العین خواہید دید،

پر ختم ہو جاتا ہے۔ باقی عبارت مولوی سراج الدین احمد کے نام کے مکتوب نمبر ۲۰ کا حصہ ہے۔

(۵۵) "ست" = من خود از یں۔

(۵۶) "ت" = سراسیمگی ہا۔

(۵۷) "ت" = و نواب صاحب را۔

(۵۸) "ت" = "را" ندارد۔

(۵۹) "ت" = ہماں مولوی سراج الدین۔

(۶۰) "ت" = "کہ" ندارد۔

(۶۱) "ت" = دگراں۔

(۶۲) "ت" = "ہم" ندارد۔

(۶۳) "ت" = سلامے۔

(۶۴) "ت" = آں رُوست۔

(۶۵) "ت" = بہ ایں۔

(۶۶) "ت" = بہ ایں۔

(۶۷) "اگر" اضافہ از "ت۔"

(۶۸) "من" اضافہ از "ت۔"

(۶۹) "ط" = معنی، "ت" = یعنی۔

(۷۰) "ت" میں "بیاد آرند" کے بعد دو صفحات کے بقدر عبارت زیادہ ہے۔

(۷۱) "ط" = رونق۔

(۷۲) "ط" = بادا۔

(۷۳) "ط" = قار۔

(۷۴) "ط" = منشاء۔

(۷۵) "ط" = حیات۔

(۷۶) "ط" = تنہا۔

(۷۷) "ط" = ازایں۔

(۷۸) "ط" = یافتہ ایم

(۷۹) اس مصرع کو "ط" میں، غالباً بہ اتباعِ "ن"، بطورِ نثر لکھا گیا ہے۔

(۸۰) "ط" میں یہ مصرع بھی بطورِ نثر لکھا ہوا ہے۔ لفظ "سیاہ" کا املا بھی بسقوطِ الف ("سیہ") تحریر کیا گیا ہے، جو یقیناً درست نہیں۔

(۸۱) "ط" = اندہ۔

(۸۲) "ط" = واشتہ۔

(۸۳) ممکن ہے کہ یہ تاریخ ۱۲ رمضان ہو۔

(۸۴) "ط" = بہ زرروے۔

(۸۵) "ط" = بنگرد۔

(۸۶) "ط" = می خواہد بود کہ۔

(۸۷) "ط" = "اگر" سے پہلے لفظ "این" زائد ہے۔

(۸۸) "ط" = بہ ہواخواہی۔

(۸۹) "ط" = یادآفرہ۔ یہ لفظ "یادآفراہ" اور "یادکراہ" دونوں طرح مستعمل ہے۔ غالب نے عام طور پر "یادآفراہ" لکھا ہے:

اگر این تغافل بہ یادآفراہِ جرمے دیگر است، نخست گناہ مرا خاطر نشانِ من باید کرد۔

("کلیاتِ نثرِ غالب"، مطبوعہ جنوری ۱۸۷۱ء، ص ۱۴۳)

این آدم پیکرِ دیوسار یادآفراہِ نکوہشِ بے جا و کیفرِ نفرینِ ناروا یافتے۔ (ایضاً، ص ۲۵۲)

ان مثالوں کے پیشِ نظر ہم نے "یادآفراہ" کو ترجیح دی ہے۔

(۹۰) یہاں "خواستے" کی رعایت اور سیاقِ عبارت کے لحاظ سے "نقش بستے" کی بجائے "ساختے" ہونا چاہیے۔

(۹۱) "ط" = دینار بزہ ("با" ندارد)۔

استدراک

مکتوب نمبر ۱۴۴: یہ خط کلکتے کے اس مشہور معارضے سے تعلق رکھتا ہے جس میں غالب کی فارسی دانی کو ہدفِ اعتراض بنایا گیا تھا۔ غالب نے اس میں ایک "مجموعۂ نثر" کے حوالے سے گفت گو کی ہے جو اس سلسلے کے بعض اعتراضات پر مشتمل تھا اور مکتوب الیہ نے اسے براہِ راست ان کے پاس بھیجا تھا۔ خط کے بعض، بلکہ بیش تر، اندراجات سے صاف طور پر یہ ظاہر ہے کہ اس کے مکتوب الیہ اور معترض دو مختلف افراد نہیں۔ چوں کہ آغازِ خط میں مکتوب الیہ کو "جناب مرزا صاحب، والامناقب، ستودہ شیم، مجمعِ لطف و کرم" کے القاب سے یاد کیا گیا ہے، اس بنا پر قاضی صاحب نے مجموعے کے بیش تر خطوط کی طرح اس خط کو بھی بلا تامل مرزا احمد بیگ تپاں کے نام کے خطوط میں شامل کر لیا تھا۔ اب غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ تپاں تو غالب کے ہم دردوں اور ہم نواؤں میں شامل تھے، اس لیے ان کی طرف سے اس معارضے کے دوران کلامِ غالب پر اعتراضات وارد کرنے اور انھیں مجموعے کی صورت میں ترتیب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موجودہ معلومات کے مطابق دوسرے مرزا صاحبان، جن کے نام اس سلسلے میں لیے جا سکتے ہیں، مرزا ابوالقاسم خان، مرزا اکبر بیگ اور مرزا افضل بیگ ہو سکتے ہیں۔ چوں کہ مرزا ابوالقاسم خاں بھی تپاں کی طرح غالب کے ساتھ ہم دردی رکھنے والوں میں شامل تھے اور مرزا اکبر بیگ اس جھگڑے سے بظاہر لاتعلق رہے، اس لیے یہ حضرات بھی اس خط کے مکتوب الیہ نہیں ہو سکتے، البتہ مرزا افضل بیگ کے بارے میں یہ بات اب شواہد سے ثابت ہو چکی ہے کہ اس فساد کے اصل بانی وہی تھے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط انھی کے نام لکھا گیا ہوگا۔ اگر یہ قیاس درست ہے، اور بظاہر اس کے درست ہونے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، تو اس مجموعے کے مکتوب الیہم کی فہرست میں یہ نام ایک اور اضافہ قرار پائے گا اور یہ اضافہ اس اعتبار سے منفرد ہوگا کہ مرزا افضل بیگ کے نام غالب کا کوئی اور خط موجود نہیں۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "مجموعۂ نثر"، جس کے حوالے سے یہ خط لکھا گیا ہے، چوتھے اور پانچویں ماہانہ مشاعروں، منعقدہ ۷ ستمبر اور ۵ اکتوبر ۱۸۲۸ء، کے بعد کسی وقت مرتب کیا گیا ہوگا۔ اس اعتبار سے اس خط کا زمانۂ تحریر اکتوبر ۱۸۲۸ء قرار دیا جا سکتا ہے۔

حواشی بر حواشیِ قاضی عبدالودود

از

ڈاکٹر حنیف نقوی

حصۂ اوّل

(حواشیِ نثرِ اردو)

(۱) ازرُوے خاتمہ یہ کتاب بتاریخ بست و نہم ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ مطابق ۲ اکتوبر ۱۸۶۴ء، مطبعِ اکمل المطابع دہلی میں چھپ کر، شائع ہوئی تھی۔

(۲) قاضی صاحب کے علاوہ باقی تمام غالب شناسوں کی بھی یہی رائے ہے کہ "لطائفِ غیبی" اگرچہ میاں دادخاں سیاح کے نام سے شائع ہوئی، ہے مگر اصلاً یہ خود غالب کی لکھی ہوئی ہے۔ مرتّب کو اس رائے سے جزوی طور پر اختلاف ہے۔ داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ سیاح کی تصنیف نہیں۔ بطورِ مثال "محرقِ قاطعِ برہان" کے مؤلف منشی سعادت علی کے بارے میں مصنّف کا بیان ہے:

> منشی جی بہ ذاتِ خود سنی ہیں اور حقیقی بھائی ان کے شیعی سنی ہیں۔ محرّم میں بھس اڑاتے پھرتے ہیں، حاضریاں کھاتے پھرتے ہیں۔ اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو برا کہتے ہیں اور منشی جی کے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہیں، اُن پر منشی جی کو کبھی غصّہ نہ آیا، خلفاے راشدین کی مذمت سے منع نہ فرمایا۔ ("رسائل"، ص ۱۹۷)

یہ تحریر منشی سعادت علی سے مصنّف کی براہِ راست اور قریبی واقفیت پر دلالت کرتی ہے، جب کہ سیاح کے اس وقت تک دہلی آنے اور وہاں کے کسی شخص کی نجی زندگی اور روزمرہ کے معمولات سے اس طرح واقف ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اس لیے وہ قطعاً اس کے مصنّف

نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک غالب سے اس کے انتساب کا تعلق ہے، شواہد اس کی بھی تائید نہیں کرتے، مثلاً مصنف نے "اسف" کے مشتقات کو "افسوس" کے مشتقات قرار دینے سے متعلق غالب کے سہو کی تاویل اس طرح کی ہے:

> یہ سہوِ طبیعت ہے، قصورِ فہم نہیں ہے۔ اکابرِ اُمت کو مسائلِ فقہ اور مناظرہ فنِ کلام میں ایسے سہو واقع ہوئے ہیں۔ علامہ تفتازانی کو سید جرجانی سے مقولہ علم میں تا دیر سکوت رہا ہے اور صاحبِ "متنِ کیدانی" کو ایسا ناہموار مغلطہ پیش آیا ہے کہ اس نے "اشارہ سبابہ فی التحیات" کو، باآں کہ مسنون ہے، "محرماتِ صلوٰۃ" میں لکھا ہے۔ نہ اس سکوت سے علامہ تفتازانی۔۔ کی تحمیق لازم آتی ہے، نہ اس بیان سے صاحبِ "متنِ کیدانی" کی تکفیر ہو سکتی ہے۔

("رسائل"، ص ۲۰۶)

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، غالب فقہ و کلام جیسے علوم میں اتنا درک اور دخل نہیں رکھتے تھے کہ اس عالمانہ تحریر کو ان کی تراوشِ قلم کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ اس پس منظر میں ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب نہ تو سیاح کی تصنیف ہے اور نہ غالب کی، بلکہ کسی تیسرے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ تیسرا شخص غالب کا کوئی "دوستِ روحانی" اور "من جملہ رجال الغیب" تھا، یعنی یا تو مصنف کی حیثیت سے وہ اس دور کے معاشرے میں متعارف نہ تھا، یا اپنی شخصیت کو بوجوہ پسِ پردہ رکھنا چاہتا تھا اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں اسے مدد دے رہے تھے۔

(۳) "لقا" = پیشِ آئینہ۔

(۴) "اشرف الاخبار"۔۔۔ کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو

پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے
کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع
منظور ہے۔ (مکتوب، مورخہ سہ شنبہ، ۷ شوال ۱۲۸۳ھ)

اس سلسلے میں غالب کا یہ بیان زیادہ اہم ہے:

تمھیں جو میں نے "سیف الحق" خطاب دیا ہے، اپنی فوج
کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے
بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے
گی۔ "لطائفِ غیبی" نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں۔

(مکتوب، مورخہ سہ شنبہ، ۷ شوال ۱۲۸۳ھ)

(۵) رسالہ موسوم بہ "محرقِ قاطعِ برہان" جو ثاقب نے تم کو بھیجا
ہے، میرے کہنے سے بھیجا ہے۔ میرا ایک دوستِ
روحانی، کہ وہ من جملۂ رجال الغیب ہے، ان جفوات کا خاکہ
اڑا رہا ہے۔ نیر رخشاں نے اس کو مدد دی ہے۔ تم بھی
بھائی مدد دو! (مکتوب، مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اس زمانے میں زیرِ تسوید تھا۔

(۶) قدر نے اپنے خط میں مولوی نجف علی کے رسالے "دافعِ ہذیان" کی، جو
"محرقِ قاطعِ برہان" کے رد میں ہے، تعریف کی تھی۔ غالب اس کے جواب
میں لکھتے ہیں:

مولوی نجف علی صاحب کی کیا تعریف کرتے ہو، تم کچھ
لکھو تو جانوں۔ تم میرے یار ہو اور میری خدمت گزاری
کے حقوق ہیں تم پر۔ مجھ کو مدد دو اور اپنی قوتِ علمی
صرف کرو۔

(۷) "سیرِ سیاح" لکھنؤ اور کان پور کے دو مشاعروں کا گل دستہ ہے جو ۱۸۷۲ء
میں مطبعِ نول کشور سے شائع ہوا ہے۔ اسے منشی انوار حسین، تسلیم سہسوانی

اور نواب احمد حسن خاں جوشؔ نے مرتب کیا ہے۔ اس گل دستے کا مقدمہ، جو سیاحؔ کے شمالی ہند کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے، بصیغۂ واحد متکلم لکھا گیا ہے، لیکن مرتب کے پاس اس کا جو نسخہ ہے، اس میں اس کے سرِ عنوان بائیں طرف کے حاشیے پر "ریختۂ قلمِ بندہ انوار حسین تسلیم سہسوانی" لکھا ہوا ہے۔ اندازِ نگارش سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ تسلیمؔ کی تحریر ہے جہاں تک غالبؔ اور سیاحؔ کے تعلقات کا سوال ہے، اس مقدمے سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ دہلی کے دوران:

> حضرت مولانا و استاذنا غالبؔ کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ نواب محمد ضیاء الدین خاں صاحب بہادر نے نہایت تکلف سے خوانِ نعمت مرحمت فرمایا... شبِ روزِ روانگیٔ لکھنؤ مرزا حسین علی خاں صاحب خلفِ متبنّیٰ حضرتِ غالب مرحوم نے خوانِ کوزہ ہائے نبات سے شیریں کام کیا، توشۂ سفر ساتھ دیا۔ (ص ۵)

(۸) مالک رام صاحب کا بیان ہے:

> تقریباً ۸۵ برس کی عمر تھی جب ۱۹۰۷ء میں سورت میں وفات ہوئی۔ ("تلامذۂ غالب"، طبعِ ثانی، ص ۲۹۲)

سید ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے کہ:

> سیاحؔ نے ۱۹۰۷ء میں قریب ۹۰ سال کی پختہ عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ("سخن ورانِ گجرات"، ص ۱۶۳)

گویا اس بات پر سیاحؔ کے تمام سوانح نگار متفق ہیں کہ ان کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا لیکن زمانۂ ولادت کا تعین قیاسات پر مبنی ہونے کی وجہ سے سنینِ عمر کے سلسلے میں ان کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

(۹) "مآثرِ غالب" کی اشاعت کے وقت تک "لطائفِ غیبی" کا صرف ایک ایڈیشن شائع ہوا تھا، اس لیے "نسخوں" لکھنا احتیاط کے خلاف ہے، اس سے

قارئین غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ طبعِ اوّل کے بعد ۱۹۶۷ء میں ایک ساتھ اس رسالے کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ ہندوستان میں اسے قاضی عبدالودود نے صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی کے زیرِ سرپرستی "قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ" کے سلسلے میں مرتب کر کے ادارہ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ کی طرف سے شائع کیا۔ پاکستانی ایڈیشن مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے شائع ہوا، یہ جناب خلیل الرحمان داؤدی کے مرتبہ "مجموعۂ نثرِ غالب، اردو" میں شامل ہے۔ چوتھا ایڈیشن سید معین الرحمان نے الوقار پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔

(۱۰) یہ کتاب مارچ ۱۸۶۷ء میں زیرِ تسوید تھی (مکتوب بنام ذکا، مؤرخہ ۱۴ و ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء) مطبوعہ اکمل المطابع، دہلی۔ ۱۲۸۴ھ کے اوائل میں چھپی ہوگی۔ دوسری بار ۱۹۶۷ء میں "قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ" اور "مجموعۂ نثرِ غالب، اردو" کے تحت پٹنہ اور لاہور سے بیک وقت شائع ہوئی۔

(۱۱) یہ کتاب ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں لکھی گئی اور ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مطبعِ مظہر العجائب، کلکتے میں چھپ کر شائع ہوئی۔ سالِ تصنیف "تحریر تام طیب" سے اور سالِ طباعت "ردِ غالب آمد" سے نکلتا ہے۔

(۱۲) یہ کتاب مطبع مصطفائی، دہلی میں طبع ہوئی تھی۔

(۱۳) "قاطعِ برہان" کی اشاعت (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء) کے بعد اس کے رد میں جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے پہلی چار کتابوں کے درمیان، داخلی شواہد کی بنا پر، حسبِ ذیل ترتیب قائم کی گئی ہے:

۱) "محرقِ قاطعِ برہان" از سید سعادت علی، مطبوعہ: ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء
۲) "ساطعِ برہان" از مرزا رحیم بیگ، مطبوعہ: ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء
۳) "مؤیدِ برہان" از مولوی احمد علی، مطبوعہ: ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء
۴) "قاطع القاطع" از مولوی امین الدین، مطبوعہ: ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء

اس ترتیب کے مطابق مولوی احمد علی مخالفینِ غالب کی صف میں

تیسرے نمبر پر آتے ہیں، اسی لیے قاضی صاحب کا خیال ہے کہ:

> غالب نے احمد [علی] کو "رابعہم" جو کہا ہے، صحیح نہیں۔ ظاہرا یہ کتاب اشاعت کے بہت بعد غالب کی نظر سے گزری اور وہ اسی بنا پر اسے "قاطع القاطع" سے مؤخر سمجھے۔

قاضی صاحب کے علاوہ دوسرے محققین و مصنفین نے بھی ان کتابوں کے درمیان یہی ترتیب قائم کی ہے، یعنی بالواسطہ طور پر انھیں بھی غالب کے متذکرہ بیان سے اختلاف اور قاضی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے، لیکن واقعہ غالباً یہی ہے کہ احمد علی کی کتاب مولوی امین الدین کی "قاطع القاطع" سے مؤخر اور اس سلسلے کی چوتھی تصنیف ہے، بلکہ ذاتی مشاہدے اور مطالعے کی بنیاد پر مرتب کا خیال ہے کہ "قاطع القاطع" اپنے زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے "مؤیدِ برہان" ہی سے نہیں، باقی دونوں کتابوں سے بھی مقدم ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مولوی امین الدین اور ان کی کتاب کا حوالہ خود "محرقِ قاطعِ برہان" میں موجود ہے، جو اس قضیے کے سلسلے کی اولین کتاب تصور کی جاتی ہے۔ غالب کی عام روش اور طریقِ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحبِ "محرق" نے لکھا ہے:

> بے اصل اعتراض می فرماید و الفاظِ ناروا می نگارد۔ شاید این نگارش ہمیں اوراق و "قاطعِ قاطعِ برہان" کہ مولوی امین الدین، المتخلص بہ امین، تردیدِ کل اعتراض ہاے مذکورۂ "قاطعِ برہان" دراں کردہ است۔ ہر کہ خواہد بنگرد۔

(ص ۶۴)

"محرق" کے اسی اندراج کی طرف "لطائفِ غیبی" میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

> ۶۴ صفحے کی ۱۶ سطر میں ایک لوی صاحب کا نام لے کر

لکھتے ہیں کہ انھوں نے "قاطعِ قاطعِ برہان" میں خوب کچھ لکھا ہے، اہاہاہا، اب بھید کھلا۔ منشی جی کو اپنی کتاب کے قصیدے میں مولوی صاحب کا تتبع منظور ہے۔ "قاطعِ قاطعِ برہان" اور "محرقِ قاطعِ برہان!" مولوی جی نے "قاطعِ برہان" کو کاٹا، منشی جی نے جلایا۔ بہرحال منشی جی کو مولوی جی کے ذکر سے اپنے کو اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ میں مرد نہیں، میرا بھائی مرد ہے۔

("رسائل"، ص ۲۳۲)

ان حوالوں کی بنیاد پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ "قاطع القاطع" اپنی ابتدائی صورت میں غالباً "قاطعِ قاطعِ برہان" کے نام سے شائع ہو کر، یا کم از کم مرتب ہو کر، "محرقِ قاطعِ برہان" کی اشاعت (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء) سے قبل دہلی کے ادبی حلقوں میں عام ہو چکی تھی، لیکن دیباچہ کتاب میں درج دو قطعاتِ تاریخ کے بموجب اس کی ترتیب کے اتمام کا سال ۱۲۸۱ھ ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں مولوی امین الدین نے اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے موجودہ شکل دی ہوگی۔ اس کے دو سال بعد ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں اس کی طباعت کی نوبت آئی۔ "محرقِ قاطعِ برہان" میں "قاطع القاطع" کے ذکر کی موجودگی سے قاضی صاحب بھی باخبر تھے، چناں چہ انھوں نے اس حوالے کو "سعادت اور امین کے ذاتی تعلق پر مُشعر" قرار دیا ہے، لیکن یہ محض اتفاق ہے کہ ان کا ذہن اس اشکال کی طرف منتقل نہیں ہوا۔

(۱۴) ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرّس، مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا "مؤیدِ برہان"، اس رسالے میں وضع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تُو نے دکنی پر کیے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ

اعتراضات وارد کیے ہیں... بس بھائی امین نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا۔

(مکتوب بنام ذکا، مورخہ دو شنبہ، ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ)

(۱۵) غالب کو "مؤیدِ برہان" ۱۴ مارچ ۱۸۶۷ء (۸ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ) سے کچھ پہلے مل گئی تھی۔ اسی تاریخ کے ایک خط میں انھوں نے ذکا کو لکھا ہے:

"مؤیدِ برہان" میرے پاس بھی آ گئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقیدِ شمارِ صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں، وہ تمھارے پاس بھیجوں گا... تم اس کا جواب لکھو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال، جہاں جہاں مناسب جانو، درج کر دو۔ میں اب قریبِ مرگ ہوں۔

(۱۶) سرورق کے اندراجات کے مطابق یہ کتاب ۱۸۶۸ء میں، یعنی غالب کی زندگی ہی میں، مولوی غلام نبی خاں کے مطبعِ نبوی (واقع کلکتہ) میں چھپ کر شائع ہو چکی تھی۔

(۱۷) یہ کتاب سرورق کے اندراج کے مطابق "تحقیقِ مثنوی و تعریفِ مثنوی گویانِ فرس" پر مشتمل ہے اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے حسب الحکم ۱۸۷۳ء میں بپٹسٹ مشن پریس، کلکتہ میں چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ دراصل یہ "سکندر نامۂ بحری" کے مقدمے کے مجوزہ سات حصوں میں سے ایک حصہ ہے، جسے مصنف کی وفات کے بعد ان کے شاگرد اور معروف مستشرق ایچ بلاخمین نے شائع کیا ہے۔

(۱۸) "طا" = "میں" ندارد۔

(۱۹) جن کتابوں کا ذکر آ چکا ہے، ان کے علاوہ تصانیف کے زمرے میں بلاخمین نے دو مختصر رسائل: (الف) رسالہ "ترانہ" اور (ب) رسالہ "اشتقاق" کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کتابوں کی تصحیح کی ان میں (الف) مثنوی ویس و رامین (ب) "سکندر نامۂ بحری" (ج) "اقبال نامۂ جہانگیری" (د) "منتخب التواریخ"

(ہ) "مآثر عالمگیری" اور (و) "اکبر نامہ" (ابوالفضل) کے پہلے دو ابواب شامل ہیں۔

(۲۰) احمد علی ۱۰ شوال ۱۲۵۵ھ (۱۷ دسمبر ۱۸۳۹ء) کو ڈھاکے میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے ۱۸۶۲ء میں کلکتے میں "مدرسۂ احمدیہ" قائم کیا۔ دو برس کے بعد ۱۸۶۴ء میں پروفیسر کاویل کی سفارش پر انھیں "مدرسۂ عالیہ، کلکتہ" میں مدرسِ فارسی مقرر کیا گیا۔ ۶ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ (۳ جون ۱۸۷۳ء) کو عین عالمِ جوانی میں ڈھاکے میں ان کا انتقال ہوا (مقدمۂ "ہفت آسماں")۔

(۲۱) تذکرۂ "گلستانِ سخن" قادر بخش کے نام سے شائع ہوا ہے۔ بعض محققین، جن میں قاضی صاحب بھی شامل ہیں، اسے صابر کے استاد امام بخش صہبائی کی تصنیف مانتے ہیں۔ اس جملے میں صہبائی کی تکرار اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔

(۲۲) مرزا رحیم بیگ "ساطعِ برہان" کی ترتیب سے ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں فارغ ہو چکے تھے۔ انھوں نے اس وقت خود ہی اس کی تاریخ "بدائع النظائر" سے نکالی تھی۔ یہ پہلی اور آخری بار ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں "مطبعِ ہاشمی، میرٹھ" میں چھپ کر شائع ہوئی۔

(۲۳) اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو "لطائف غیبی" میں رد کر چکے ہو۔ (مکتوب بنام سیاح، مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء)

(۲۴) "نامۂ غالب" خط کی صورت میں قضیۂ "قاطعِ برہان" سے متعلق غالب کا ایک مختصر رسالہ، یا مضمون، ہے جس میں انھوں نے لغت نگاری کے سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت بھی کی ہے اور رحیم بیگ کے بعض اعتراضات کے جواب بھی دیے ہیں۔ یہ خط، یا رسالہ، پہلی بار ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء سے کچھ دن قبل "مطبعِ محمدی محمد مرزا خان میں بیچ کنپ دہلی اندرون کوچہ چیلہ" چھپ کر شائع ہوا تھا۔ یہ کل سولہ صفحات پر مشتمل تھا اور

اس کی طباعت کے تمام اخراجات غالب نے خود ہی برداشت کیے تھے۔ دوسری بار یہ "اودھ اخبار" لکھنؤ کے ۱۰ اکتوبر اور ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کے دو شماروں میں بالاقساط شائع ہوا۔

(۴۵) ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ:

"نامۂ غالب" "ساطعِ برہان" کا جواب نہیں۔ اس میں چند جزوی بحثوں کو چھیڑا گیا ہے اور وہ بھی بڑی حد تک تشنہ ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غالب کے خیال میں مرزا رحیم بیگ نے "ساطع" میں "محرق" کے مضامین لفظی تصرف کے بعد نقل کر دیے تھے جن کو سیاح "لطائف" میں پہلے ہی تفصیل کے ساتھ رد کر چکے تھے۔

("غالب، فکر و فن"، ص ۲۳۱)

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک:

"ساطعِ برہان" ... "مؤید" کے بعد ... "قاطع" کا سب سے زیادہ معقول اور مدلل جواب ہے۔ (ایضاً، ص ۲۳۸)

(۴۶) مولوی امین الدین کب پیدا ہوئے اور کب تک زندہ رہے؟ یہ کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہوتا۔ غالب کے قائم کردہ ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمے میں فروری ۱۸۶۸ء (ذیقعدہ ۱۲۸۴ھ) میں بیانِ صفائی کے دوران انھوں نے اپنی عمر ۵۹ سال بتائی ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اسی بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد کا نام مولوی زین الدین تھا اور اس زمانے میں وہ پٹیالے میں مدرس کی حیثیت سے برسرِ کار تھے۔

(۴۷) مولوی عبداللہ خاں علوی دہلی کے ان ممتاز فارسی دانوں اور سخن وروں میں

شامل تھے جن کی "ہم دمی" اور "ہم نفسی" پر خود غالب کو ناز تھا۔ اپنی ایک غزل کے قطعہ بند اشعار میں انھوں نے اس سلسلے کے دوسرے سر برآوردہ حضرات کے ساتھ اس طرح ان کا ذکر کیا ہے:

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود
باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی واں گاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہم دمِ شاں

(۲۸) ازالۂ حیثیتِ عرفی کے عرضی دعوے میں اس کتاب کے متعلق غالب کا بیان ہے:

اگرچہ بنا کتاب کی بحثِ علمی پر ہے لیکن اس (مصنّف) نے اس بحثِ علمی میں میرے واسطے وہ الفاظِ ناشائستہ لکھے اور ایسی گالیاں دی ہیں کہ کوئی شخص کولی چمار کو بھی یہ الفاظ نہ لکھے اور ایسی گالیاں نہ دے گا۔

("احوالِ غالب"، ص۱۳۹)

(۲۹) مفتی محمد عباس صاحب نے "قاطعِ برہان" کی رسید میں کتاب کی تعریف کے بعد یہ شعر لکھا تھا:

ظرافت نے آفت کو برپا کیا
درشتی نہ کرنی تھی، یہ کیا کیا

("تجلیات": حصہ ۲، ص۱۹۶)

(۳۰) یہ روداد "رودادِ مقدمۂ مرزا غالب" کے زیرِ عنوان "احوالِ غالب" میں بھی

دیکھی جا سکتی ہے۔

(۳۱) غالب کے خلاف گواہی دینے والے چار افراد میں سب سے اہم نام مولوی ضیاء الدین، پروفیسر عربی، دہلی کالج، کا ہے۔ سبھی گواہوں نے اپنے بیانات میں امین الدین کے استعمال کردہ الفاظ اور ان کی عبارات کی اس انداز سے تاویلات کی ہیں کہ کوئی بھی پڑھا لکھا اور منصف مزاج شخص انھیں بہ آسانی رد کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی بات ان بیانات میں نظر نہیں آتی جسے مقدمے کے تناظر میں خلافِ معمول کہا جا سکے۔

(۳۲) اس مقدمے میں غالب کے وکیل مولوی عزیز الدین بدایونی تھے جو غالب کے شاگرد بھی تھے اور عزیز و صادق تخلص کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مقدمے میں اس کی نوبت ہی نہیں آئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکیں۔

(۳۳) ۱۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو گواہانِ صفائی کے بیانات ہوئے اور اس کے دسویں روز، یعنی ۲۳ مارچ کو، وکیلِ مدعی کی طرف سے راضی نامہ داخل کر دیا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ:

> بہ فہمائشِ چند گرامی روساے شہر باہم رضامندی ہوئی۔ اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابتِ مقدمہ باقی نہیں۔ مقدمہ داخلِ دفتر ہو جاوے۔

(۳۴) یہ قطعہ دراصل ابنِ یمین کا ہے ("دیوانِ اشعارِ ابنِ یمین"، مرتبہ حسین علی باستانی، ص ۶۱۸)۔

(۳۵) "ٹا" = وگر۔ دیوان = گر بمانیم زندہ۔ "ور بمردیم" بجاے "ور نمانیم۔"

(۳۶) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس نشان (ے) کو "مصنف" کا مخفف قرار دیا ہے (مکتوب بنام عرشی، مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۳ء، "نقوش"، خطوط نمبر،

حصۂ سوم، ص ۲۳)۔ مرتب کے نزدیک یہ "مصحح" کا مخفف ہے۔ غالب نے آغا احمد علی کی "موید برہان" کے حاشیوں پر جو ۱۲۰ یادداشتیں لکھی تھیں، ان میں سے ۶۲ کے آخر میں یہ نشان موجود تھا (مکتوبِ مذکور الصدر)۔ ظاہر ہے کہ کسی دوسرے کی تحریر پر اعتراض کرنے والا، یا اس کی غلطیاں نکالنے والا مصنف نہیں ہو سکتا، مصحح ہی ہو سکتا ہے، جس کے معنی "درست کرنے والا"، یا "غلطیاں دور کرنے والا"، ہوتے ہیں۔ (۳۷)

"ط" = "موید" میں۔ (۳۸)

یہ منشی سعادت علی خاں ازالۂ حیثیتِ عرفی کے مقدمے میں غالب کی طرف سے بطورِ گواہ پیش ہوئے تھے۔ اس مقدمے کی فہرستِ گواہان میں ان کے نام کے ساتھ "مدرس کالج دہلی" درج ہے، لیکن "سوالاتِ عبدالکریم" اور "تیغ تیز" میں اپنے جوابات کے آخر میں خود انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "ملازم گورنمنٹ اسکول دہلی" لکھا ہے۔ (۳۹)

اس سلسلے میں خود غالب کا یہ بیان کم دل چسپ نہیں کہ:

آناں کہ قولِ پدرو کسی ہرزہ انگارند، کلامِ مادرش را چرا سند

پندارند۔ ("رسائل"، ص ۱۹۴) (۴۰)

"ط" = عہد ساز۔ چوں کہ "غلط ساز" اور "عہد ساز" دونوں صریحاً سہوِ کاتب ہیں۔ اس لیے متن میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ (۴۱)

قطران (متوفّی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲-۷۳ء) کے لغت کا حوالہ "فرہنگِ جہانگیری" کے مولف نے اپنے مآخذ کی فہرست میں دیا ہے۔ اسی بنا پر قاضی صاحب نے اپنے مضمون "غالب بہ حیثیتِ محقق" میں یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ لغت عہدِ جہاں گیری تک موجود تھی۔ رشید حسن خاں صاحب کا خیال ہے کہ "فرہنگِ جہانگیری" کے مولف کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے کیوں کہ اگر یہ لغت جہاں گیر کے زمانے تک موجود ہوتی تو اس کے علاوہ اس سے کوئی اور بھی واقف ہوتا (مکتوب بنام راقم، مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۳ء)۔

(۴۲) اسدی کی لغت "لغتِ فرس اسدی" کے نام سے تین بار شائع ہو چکی ہے۔ پہلی مرتبہ "پال ہورن" نے چھاپی تھی، بعد ازاں دو بار ایران میں چھپ چکی ہے۔ یہ ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء سے قبل کی تالیف ہے اور سب سے قدیم مخطوف لغت تسلیم کی جاتی ہے ("نقدِ قاطعِ برہان"، ص ۴)۔

(۴۳) شمس فخری کی لغت کا نام "معیارِ جمالی" ہے۔ یہ ۷۴۵ھ/۴۵-۱۳۴۴ء کی تالیف ہے۔ ڈاکٹر صادق کیا نے اسے ترتیب دے کر تہران یونی ورسٹی سے شائع کر دیا ہے ("نقدِ قاطعِ برہان"، ص ۵)۔

(۴۴) "ط" =اورا کہ مشکل بود۔

(۴۵) "ط" = "ز" ساکن ہے اور "و" متحرک۔ ہم نے بہ نظرِ احتیاط یہاں، اور آگے بھی، حروف کو ان کی صورتِ ملفوظی کے مطابق لکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ خود غالب نے بھی ایک جگہ یہی طریقہ اپنایا ہے۔ علائی کو ۲۴ دسمبر ۱۸۶۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

اسیر کو اور اپنے بزرگ کو، کبھی بہ صیغۂ مفرد نہ لکھیں۔ یہ وہی چھوٹی "ہے"، "بڑی" سے ہم کا قصہ ہے۔

("گردوے معلّٰی"، طبعِ اول، ص ۳۹۵)

(۴۶) "ط" = کبھی۔

(۴۷) "ط" = کا۔

(۴۸) "ط" = سپنجاب۔

(۴۹) سخن وراں در اسکان و تحریک یارا ے تصرّف دارند۔

("رسائل"، ص ۱۶۱)

(۵۰) طغرا کا زیرِ بحث شعر یہ ہے:

روز و شب دریچۂ مشرق و مغرب باز است

ورنہ از تنگیِ ایں خانہ نفس می گیرد

غالب نے جسے "دریچہ" بہ یاے مفتوح سمجھا ہے، وہ دراصل "دریچہ" بہ یاے

تازی "درب"، بمعنی دروازہ، کی تصغیر ہے۔

(۵۱) فردوسی کا وہ شعر، جس میں "رفت" اور "گرفت" بطورِ قافیہ آئے ہیں، یہ ہے:

سر و دل پُر از کینہ کرد و برفت
تو گوئی کہ عہدِ فریدوں گرفت

(۵۲) یہ بیت خاقانی کی مثنوی "تحفۃ العراقین" سے ماخوذ ہے۔ یہی بیت "تیغ تیز" میں بھی نقل ہوئی ہے، لیکن وہاں "خور" اور "مہ" کی ترتیب باہم بدل گئی ہے ("رسائل"، ص ۲۸۰)، یعنی "مہ" مصرعِ اول کے صدر میں اور "خور" اس کی جگہ مصرعِ ثانی میں منقول ہے۔ ان دونوں متون کے برخلاف نسخۂ مطبوعہ میں اس بیت کا متن حسبِ ذیل ہے:

خور در پیشت پیادہ رفتہ
مہ غاشیۂ تو برگرفتہ

(۵۳) "طا" = ویس و یامیں۔

(۵۴) "ظا" = بستاں۔

(۵۵) "طا" = شگفتن۔

(۵۶) یہ مقدمہ نہ دلائل کا محتاج ہے نہ نظائر کا حاجت مند۔

("رسائل"، ص ۲۶۹)

(۵۷) اس سوال کی عبارت ہی اصلاح طلب ہے، کیوں کہ یہ سوالیہ نہیں، بیانیہ ہے۔ اس کی صحیح صورت یہ ہو سکتی تھی:

"راند و ماند" بروزنِ "چاند" صحیح ہے یا "رُند و مند" بروزنِ "تند و کند"؟

(۵۸) غالب کی اس روش پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں:

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے، خان آرزو تو ہندوستان زاد، اور مثل غیاث الدین مکتب دار اور رشید ٹھٹوی کے منہ لگانے کے

قابل نہیں۔ یہ فضلائے کلکتہ گویا سیدھے ایران سے
تشریف لائے تھے اور مثل عبدالصمد ہرمزد کے ساسانِ
پنجم کی نسل میں سے تھے۔

(مکتوب بنام عرشی، مؤرخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء،
بحوالہ "نقوش" لاہور، خطوط نمبر، حصۂ سوم، ص ۳۸)

(۵۹) مولانا امتیاز علی عرشی کے مطابق مرزا غالب نے "قاطعِ برہان" کی تالیف کے سلسلے میں "برہانِ قاطع" کے جس مطبوعہ نسخے کو پیشِ نظر رکھا تھا، وہ "افضل المطابع، کلکتہ" میں ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۹ء میں محمد اعظم لکھنوی کے اہتمام سے... نسخ ٹائپ میں... طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ رضا لائبریری رام پور کے "ذخیرۂ لوہارو" میں محفوظ ہے۔ سرورق کے اندراج کے مطابق اس کی تصحیح کرنے والوں میں شہر کے گیارہ "علما و فضلا" شامل تھے جن کے نام مولانا عرشی نے اپنے مضمون میں نقل فرما دیے ہیں (ماہ نامہ "ماہِ نو" کراچی، شمارہ: جنوری، فروری ۱۹۶۹ء)۔ "مطبعِ طفلی" کا نسخہ، جس کا قاضی صاحب نے یہاں ذکر فرمایا ہے، اس سے مختلف ہے۔ غالب نے اس کا حوالہ "درفشِ کاویانی" میں لفظ "استر" کے تحت دیا ہے ("رسائل"، ص ۳۴)۔ چوں کہ اول الذکر نسخہ وہ ۱۰ اگست ۱۸۵۸ء کو بطورِ تحفہ علائی کو پیش کر چکے تھے، اس لیے عرشی صاحب کا خیال یہ ہے کہ انھوں نے اس حوالے کے وقت یہ دوسرا نسخہ کسی دوست سے مستعار لیا ہوگا ("ماہِ نو"، شمارۂ مذکور الصدر، ص ۲۳۱)۔

(۶۰) "قا" میں ہر جگہ وزن "مجنون" (م ج ن و ن)، جو "مخبون" (م خ ب و ن) کی تصحیف ہے۔

(۶۱) "قا" = تاریخ۔

(۶۲) "قا" = عروض۔

(۶۳) "قا" = پاشد دیو دستور۔

(۶۴) کذا فی الاصل۔ غالباً پہلی جگہ "مفتعلن، مفاعلن، فاعلان" کی بجائے "مفتعلن،

مستفعلن، فاعلان" لکھنا مقصود ہوگا۔

(۶۵) غالب کے نقل کردہ مصرع:

چشم قاتلاں بیازش بہ تیر

کا وزن "مستفعلن، مفاعلن، فاعلان" مراد ہے۔

(۶۶) اس سوال کے سلسلے میں "فضول" بہت ہلکا لفظ ہے۔

(۶۷) غالب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

کچھ کم سات سو برس ہوئے، امیر خسرو علیہ الرحمہ کو اس
عہد میں یوں لکھتے ہوں گے۔ شاہ جہاں کے عہد میں، کہ
قطب شاہ بھی اس کا معاصر تھا، دلی میں اور دکن میں کبھی
"پانو" کو بے "نون" نہ لکھتے ہوں گے۔ ("رسائل"، ص ۳)

(۶۸) صفیر نے اپنی خود نوشت کے مطابق اکیس جلدوں میں "مجموعۂ فیضِ صفیر در علم شعر" مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ "فیضِ صفیر" اس مجموعے کا تاریخی نام ہے، جس سے اس کا سالِ آغاز ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) برآمد ہوتا ہے۔ "رشحاتِ صفیر" اس مجموعے کا ساتواں حصہ ہے۔ یہ ۱۲۸۰ھ/۶۴-۱۸۶۳ء میں تصنیف ہوا تھا۔ جناب مشفق خواجہ کی تحقیق کے مطابق "رشحاتِ صفیر" کے علاوہ "فیضِ صفیر" کے:

باقی حصوں کے طبع ہونے کا تو کیا، سوائے ایک کے،
لکھے جانے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

("غالب اور صفیر بلگرامی"، ص ۳۳)۔

(۶۹) "رشحات" کا یہ دوسرا ایڈیشن ۱۲۹۳ھ/۷۷-۱۸۷۶ء میں "مطبعِ نور الانوار، آرہ" سے طبع ہوا تھا (ایضاً، ص ۳۳)۔

(۷۰) یہ پہلا ایڈیشن ۱۲۸۹ھ/۷۳-۱۸۷۲ء میں آرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس رسالے کا نام "رشحاتِ صفیر"، جس سے ۱۲۸۹ھ برآمد ہوتا ہے، اسی اشاعتِ اول کے وقت رکھا گیا تھا۔ غالب نے اس کا جو "دیباچہ" لکھا تھا، وہ

اسے ربیع الاول ۱۲۸۳ھ/اگست ۱۸٦٦ء میں حضرت صاحبِ عالم مارہروی کے توسط سے صفیر کو بھیج چکے تھے (ایضاً، ص ۴۳-۴۲و۱۱۱)۔

(۷۱) مشفق خواجہ کی تحریر کے مطابق:

> رشحات کے مکمل متن کی اشاعت سے پہلے ۱۲۷۸ھ/٦۲-۱۸٦۱ء میں اس کا خلاصہ "خلاصۂ فیضِ صفیر" کے نام سے مطبعِ چشمۂ علم، پٹنہ سے طبع ہوا تھا۔ یہی خلاصہ دوبارہ صفیر کے پوتے سید عنایت احمد بلگرامی نے ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں رفاہِ عام اسٹیم پریس، لاہور سے طبع کرایا تھا۔ (ایضاً، ص ۴۳)

قاضی صاحب کا اشارہ غالباً اسی دوسرے ایڈیشن کی طرف ہے۔

(۷۲) ہمارا خیال یہ ہے کہ غالب نے اپنے زمانے کی روشِ املا کے مطابق "ٹکٹ لیٹیں بھول گیا" اور "ٹکٹ بکس میں پائی" لکھا ہوگا، اسی لیے صفیر کو یہ غلط فہمی ہوئی ہوگی، لیکن یہ محض غلط فہمی تھی، کیوں کہ میر ولایت علی خان کے نام کے پہلے خط کے مطابق ٹکٹ ایک نہ تھا، دو روپے کی مالیت کے دو ٹکٹ تھے۔

(۷۳) یہ پہلا خط جو ۸ ذیقعدہ (۱۲۸۱ھ) کا لکھا ہوا ہے، "انشائے سیدِ گل"، مرتبہٗ سید محمد ہاشم، مطبوعہٗ نور الانوار، آرہ، میں شامل ہے۔ مشفق خواجہ نے اسے اپنی کتاب (ص ۱۱۹) میں نقل کر کے عام کر دیا ہے۔

(۷۴) "ظا" = ۱۲۷۰ء۔

(۷۵) "ظا" = ہندوستانی۔

(۷٦) اس لفافے کا عکس ماہ نامہ "ماہِ نو" کراچی کے جنوری، فروری ۱۹٦۹ء کے شمارے (غالب نمبر) میں بھی شامل ہے (مقابلِ ص ۲۱۳)۔

(۷۷) یہ خط، جیسا کہ صفیر نے لکھا ہے، خود انھی کے نام ہے اور میر ولایت علی کے نام کے خط سے مختلف ہے، لیکن یہ دونوں خط ایک ہی دن، یعنی ۸

ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ / ۵ اپریل ۱۸۶۵ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ "انشائے سید گل" اور "مرقعِ فیض" کے علاوہ "جلوۂ خضر" جلد دوم (ص ۲۲۳) میں بھی شامل ہے اور مشفق خواجہ نے انھی کتابوں کے حوالے سے اسے اپنی کتاب "غالب اور صفیر بلگرامی" میں نقل کر دیا ہے (ص ۷۰)۔

(۷۸) صفیر نے اپنے ترجمے کا نام "پرستانِ خیال" رکھا تھا۔ انھوں نے اسے دس جلدوں میں، جنھیں "پردہ ہائے پرستانِ خیال" کا نام دیا گیا تھا، مکمل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان میں سے پہلی دو جلدیں "صبحِ خنداں" اور "چمنستان" ۱۲۸۱ھ / ۶۵-۱۸۶۴ء میں مطبعِ عظیم المطابع، عظیم آباد سے شائع ہوئی تھیں ("غالب اور صفیر بلگرامی"، ص ۳۵ و ۳۶)۔ غالب نے ۸ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ کے خط میں میر ولایت علی سے یہی "دونوں نسخے" طلب کیے تھے۔ تیسری جلد "صبحِ بہار" کا کچھ حصہ چھپا تھا۔ باقی جلدیں طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ ان میں سے اب صرف پانچویں اور چھٹی جلد کے مسودات سید وصی احمد بلگرامی مرحوم کے کتب خانے (کراچی) میں محفوظ ہیں (ایضاً، ص ۳۶)۔

(۷۹) "انشائے سید گل" میں "حافظہ معدوم" ہی ہے۔ اسی مناسبت سے متن میں ترمیم کر دی گئی ہے۔

(۸۰) یہ مضمون بہ عنوان "میر صفیر بلگرامی اور مرزا غالب" سہ ماہی "اردو" کے جنوری ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اب "کچھ غالب کے بارے میں" (حصۂ اول) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حواشیِ نظمِ اردو

(۱) "پنج آہنگ" کا پہلا ایڈیشن مطبعِ سلطانی، لال قلعہ، دہلی میں بہ تصحیحِ حکیم غلام نجف خاں ۱۳ رمضان ۱۲۶۵ھ/۱۳ اگست ۱۸۴۹ء کو چھپ کر شائع ہوا تھا۔

(۲) اس سے پہلے "پنج آہنگ" کا ایک اشتہار، بہ عبارتِ نثر، مطبعِ سید الاخبار کی طرف سے ہفت روزہ "سید الاخبار" دہلی کے ۹ شوال المکرم ۱۲۵۷ھ/۲۳ نومبر ۱۸۴۱ء کے پرچے میں بھی شائع ہوا تھا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ دو سو خریداروں کی درخواستیں آجانے کے بعد یہ کتاب چھاپی جائے گی اور جو لوگ اس وقت درخواست دے دیں گے، ان سے اس کی قیمت چار روپے فی جلد لی جائے گی۔ بعد میں طلب کرنے والوں کو زیادہ قیمت ادا کرنی ہوگی (بحوالۂ "اردوے معلّیٰ" شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی، غالب نمبر، حصہ ۳، ص ۱۷۶)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مطلوبہ تعداد میں خریدار فراہم نہیں ہوسکے، اس لیے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

(۳) کسی شخص کا معمولاً شعر نہ کہنا یا شاعر کی حیثیت سے کہیں ذکر نہ آنا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ شاعر نہیں تھا، لیکن اس امر کے پیشِ نظر کہ کسی خاص ضرورت یا مصلحت کے تحت کسی شاگرد کے نام سے نثر یا نظم میں کچھ لکھ کر چھپوا دینا نہ صرف غالب کے، بلکہ اس دور کے عام اہلِ علم کے معمولات میں داخل تھا، قاضی صاحب کے اس قیاس سے پورے شرحِ صدر کے ساتھ اختلاف بھی نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) یہ سلسلۂ مضامین جون ۱۹۳۲ء سے جنوری ۱۹۳۳ء تک متواتر آٹھ شماروں میں شائع ہوا تھا۔

(۵) سرسید نے ان کا نام حافظ محمد مسیح الدین ("آثار الصنادید"، ص ۵۰۹)، مالک رام صاحب نے حافظ محمد مسیح الدین ("تحقیقی مضامین"، ص ۵۰) اور

عبدالرؤف عروج نے حافظ مصلح الدین خاں بتایا ہے ("بزمِ غالب"، ص ۲۹۷)۔ ازروئے قرائن اول الذکر روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

(۶) غلام نجف خاں بروزِ پنجشنبہ، ۲۳ شعبان ۱۲۲۴ھ (۵ اکتوبر ۱۸۰۹ء) شیخوپور، بدایوں میں پیدا ہوئے تھے ("تحقیقی مضامین"، ص ۵۰) اور صرف پانچ سال کی عمر میں اپنے خالو میر سید علی کے ساتھ دہلی چلے آئے تھے ("بزمِ غالب"، ص ۲۹۸)۔

(۷) غالب کا یہ کہنا کہ:

یہ تم جو پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو اس کا سبب یہ کہ
مجھ میں تمہارا لہو ملتا ہے اور میں احتراقِ خون کا مبتلا ہوں۔

فی مابین غیرِ معمولی محبت و موالست پر مبنی ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(۸) غلام فخرالدین خاں غالب کے برادرِ نسبتی مرزا علی بخش خاں کے بیٹے تھے۔ علی بخش خاں کی شادی غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم کی بیٹی لاڈلی خانم سے ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے غلام فخرالدین خاں غالب اور ان کے بھائی دونوں ہی کے نواسے ہوئے۔ دوسرا رشتہ یہ تھا کہ ان سے مرزا یوسف کی اکلوتی بیٹی عزیزالنسا بیگم منسوب تھیں، یعنی وہ غالب اور ان کے بھائی کے داماد تھے۔

(۹) غلام نجف اور محمد نجف ایک ہی شخص ہیں، حمیدالدین ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ "پنج آہنگ" والے خطوط جس زمانے میں لکھے گئے ہیں، ممکن ہے، اس زمانے میں غالب کو یہ علم نہ ہو کہ میاں نجف کا پورا نام کیا ہے۔
آئے دن کے تجربات کے پیشِ نظر یہ بات قطعاً بعید از امکان نہیں۔

(۱۰) معروف کا انتقال ۱۲۴۲ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) میں ہوا۔ شیفتہ لکھتے ہیں:

در ۱۲۴۲ھ یک ہزار و دو صد و چہل و دو... این جہانِ
گزراں را گذاشت۔ ("گلشنِ بے خار"، طبعِ اول، ص ۲۵۰)

(۱۱) یہ محمد ابراہیم بن شہاب الدین موسیٰ کا مرتب کیا ہوا شعرائے اردو کے

منتخب کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کے کئی ایڈیشن مختلف مطابع سے شائع ہو چکے ہیں۔ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۶۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

(۱۲) "معیار" سے پہلے یہ غزل ماہ نامہ "گل کدہ" بریلی کے اپریل ۱۹۲۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکی تھی۔

(۱۳) "تاریخِ جدولیہ" منشی خادم علی فاروقی سندیلوی کی تصنیف ہے۔ نام تاریخی ہے، جس سے ۱۲۶۹ھ/۵۳-۱۸۵۲ء برآمد ہوتا ہے۔ کتاب کی طباعت مطبعِ مدرسہ آگرہ میں ۱۲۷۰ھ/۵۴-۱۸۵۳ء میں شروع ہو کر ۱۲۷۲ھ/۵۶-۱۸۵۵ء میں مکمل ہوئی ("دستورالفصاحت"، دیباچۂ مصحح، ص ۱۰۲)۔

(۱۴) "ٹا" = محاورۂ ہندی (وره ہندی؟)۔

(۱۵) میر سعادت علی دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام میر باقر علی تھا جو ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں حضرت نظام الدین اولیا کے عرس میں شرکت کے لیے شہر سے درگاہ کی طرف جاتے وقت راستے میں شہید کر دیے گئے تھے (باغ۔ تحقیق نامہ، ص ۱۳۱)۔

(۱۶) "لطائف" کے دیباچے میں لکھا ہے:

> کسی محکمۂ انگریزی کا سررشتہ دار ہو گیا تھا۔۔ اب خانہ نشین ہے۔ ("رسائل"، ص ۱۹۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> میاں سررشتہ دارِ معزول، سنو! (ایضاً، ص ۲۰۹)

یہ بظاہر ازراہِ تحقیر و تضحیک لکھا گیا ہے۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہوں گے۔

(۱۷) یہ مسجد اور کنواں ۱۲۶۹ھ/۵۳-۱۸۵۲ء میں تعمیر ہوا تھا۔ مادۂ تاریخ:

چشمۂ زمزم صفت، مسجد کعبہ بنا

ہے۔ باہمی تعلقات کا اندازہ "لطائفِ غیبی" کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے جس کے مخاطب صاحبِ "محرق" ہیں:

> ایک شخص... اپنے شہر کا رہنے والا یقین ہے کہ باہم شناسائی اور سلام علیک بھی ہوگی... حد سے زیادہ ناسزا باتیں اس کے واسطے لکھنی... کون سا امرِ خیر اور ثواب کا کام ہے۔ ("رسائل"، ص ۳۳۹)

(۱۸) مالک رام صاحب نے لکھا ہے:

> یہ کتاب فارسی زبان میں ۹۶ صفحوں پر محیط ہے اور محرم ۱۲۸۰ھ (جون، جولائی ۱۸۶۳ء) میں مطبعِ احمدی شاہدرہ دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔

(ماہنامہ "آج کل"، فروری ۱۹۵۳ء، ص ۶)

(۱۹) "تیغِ تیز" میں مولوی احمد علی سے تخاطب کے ساتھ یہ لکھنے کے بعد کہ:

> تم جامعِ "محرقِ برہان"... کے مؤید و حامی ہو

لکھتے ہیں کہ:

> اب منشی جی کے واسطے دعائے تخفیفِ عذاب اور تمہارے واسطے دعائے سلامتِ ذات اور توفیقِ انصاف مانگتا رہوں گا۔ ("رسائل"، ص ۲۸۵)

اس بیان میں "دعائے تخفیفِ عذاب" سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت تک صاحبِ محرق کی وفات ہو چکی تھی۔ قاضی صاحب کے پیشِ نظر غالباً یہی بیان رہا ہوگا۔

(۲۰) "طا" = صاحب۔

(۲۱) "لطائف" سے متعلق تفصیلات گزشتہ صفحات میں موجود ہیں۔ "سوالاتِ عبدالکریم" آٹھ صفحوں پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے جس میں بقولِ غالب:

ایک طالبِ علم، مسمّیٰ بہ عبدالکریم، نے سعادت علی
مؤلفِ "محرقِ قاطع" سے سوالات کیے ہیں۔

محققینِ غالب کا خیال ہے کہ "لطائفِ غیبی" کی طرح یہ بھی خود غالب ہی کی تحریر ہے۔ اس رسالے پر کہیں مطبع کا نام اور سالِ طباعت درج نہیں۔ مالک رام صاحب نے ازروئے قیاس یہ رائے قائم کی ہے کہ اس سلسلے کے بعض اور رسالوں کی طرح یہ بھی اکمل المطابع میں چھپا ہوگا ("آج کل"، فروری ۱۹۵۳ء، ص۵)۔ مختلف شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں "لطائف" سے پہلے طبع ہو چکا تھا۔

(۴۲) یہ رسالہ مولوی نجف علی جھجری، مؤلفِ "سفرنگِ دساتیر" و "دری کشا" کی تصنیف ہے اور ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں مطبعِ اکمل المطابع دہلی میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ضخامت ۲۸ صفحات ہے (ماہِ نو"، جنوری فروری ۱۹۴۹ء، ص۲۱۱)۔ اس سلسلے میں غالب کا یہ بیان شکوک سے بالاتر نہیں کہ:

مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا سے انھوں نے "دافعِ ہذیان" لکھ کر حقِ سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔

(مکتوب بنام ذکا، مورخہ ۶/۸ دسمبر ۱۸۶۳ء)

(۴۳) ذکا کے نام کے متذکرہ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ:

منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک ان (نجف علی) کے شاگرد اور میرے آشنا ہیں... انھیں کے اظہار سے دریافت ہوا کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالے میں ہیں۔

ممکن ہے کہ یہی منشی گوبند سنگھ اس رسالے کی تصنیف کے محرک ہوں۔

(۴۴) ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں

نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔

(مکتوب بنام ذکا، مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء)

میاں دادخاں سیاح کو، جن کے نام سے "لطائفِ غیبی" شائع ہوئی ہے، طالبِ علم قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔

(۳۵) "طا" = مارد ے۔

(۳۶) یہ شعر دیوانِ غالب کی پہلی اشاعت مطبوعہ مطبعِ سید الاخبار، دہلی، اکتوبر ۱۸۴۱ء، میں ص ۵۳ پر اور غالباً اشاعتِ ثانی مطبوعہ مطبعِ دارالسلام، دہلی، مئی ۱۸۴۷ء، میں بھی موجود ہے۔

حواشیِ نثرِ فارسی

(۱) غالب "تقریظ" کے اس مفہوم سے واقف نہیں۔ ان کی معلومات کے مطابق:

> بہ لغتِ عربی عبارتے را "تقریظ" نام نہند کہ کتاب را بداں انجام دہند۔

("پنج"، مکتوب بنام میر جان جاکوب بہادر)

کلیاتِ غالب کے خاتمے کے عنوان میں بھی، "پنج آہنگ" کے مطابق، "خاتمۂ دیوان" یا "خاتمۂ کلیات" کی بجائے، "تقریظ از حضرت مصنف۔" کی موجودگی غالب کے اسی تصوّر کی نشاں دہی کرتی ہے۔ "تقریظِ مثنویِ ابرِ گہربار" کی بھی یہی کیفیت ہے۔

(۲) "باغ" میں مصرعِ اوّل اس طرح ہے:

> از ما بہ ما پیام و ہم از ما بہ ما سلام

دوسرے مصرع میں بھی "پیام" مقدّم اور "سلام" موخّر ہے۔

(۳) "قا"۔ چشم نادیدہ۔

(۴) "باغ" میں یہ رباعی اس تقریظ کے ساتھ موجود ہے، غالباً اسی لیے رباعیات کے تحت درج نہیں کی گئی۔

(۵) حالی نے "قاطع" کا سالِ طبع ۱۲۷۶ھ اور "درفش" کا سالِ طبع ۱۲۷۷ھ بتایا ہے۔

(۶) "قاطع" کے آخر میں تسلیم کی لکھی ہوئی تاریخی مثنوی پر عنوان اس طرح درج ہے:

> مثنویِ تاریخِ طبع از شیخ امیر اللہ کاتب الحروفِ "قاطع برہان"

(ص ۹۵)

اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(۷) یہ کتاب مطبعِ سراجی، دہلی، میں طبع ہوئی تھی۔

(۸) نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خاں بہادر (۱۸۳۴ء تا ۱۸۶۴ء)، ممدوحِ غالب۔

(۹) یمین الدولہ، وزیر الملک، نواب محمد علی خاں، جنوری ۱۸۶۵ء میں مسند نشین ہوئے اور دسمبر ۱۸۶۷ء میں قتل کے ایک واقعے میں ملوث ہونے کے الزام میں معزول کر دیے گئے۔ غالب نے ان کی مسند نشینی کے موقع پر بھی ایک مثنوی بطورِ تہنیت بھی کر بھیجی تھی۔ معزولی کے بعد محمد علی خاں نے اپنی باقی زندگی بنارس میں گزاری۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا یہ بیان کہ:

> نجف علی جھجری، جنھوں نے معرکۂ "قاطع برہان" کے سلسلے میں۔۔۔ "دافعِ ہذیان" لکھی تھی، بنارس میں نواب محمد علی خاں کے ساتھ تھے۔

("غالب نامہ"، شمارہ: جنوری ۱۹۸۳ء، ص ۹۱-۹۰)

یہ غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے کہ وہ ٹونک ہی سے نواب صاحب کے ساتھ آئے ہوں گے اور "دافعِ ہذیان" قیامِ ٹونک کے زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب موصوف محمد علی خاں کی تخت نشینی سے قبل ہی مرشد آباد پہنچ کر نواب ناظم کے ملازم ہو چکے تھے (مکتوب بنام ذکا، مورخہ ۸/۶ دسمبر ۱۸۶۴ء)۔ محمد علی خاں سے ان کا توسّل ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے ("کاظل الاسعاد شرحِ قصیدۂ بانت سعاد"، ص ۸)۔

(۱۰) "نا" = متنبہات۔

(۱۱) یہ کتاب احمد بن علی بن محمد بن حجر العسقلانی (۷۷۳ھ/۱۳۷۱-۷۲ء تا ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) سے منسوب ہے، بلکہ ان کے نام سے شائع بھی ہو چکی ہے، لیکن عام طور پر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہ احمد بن محمد بن علی بن حجر الہیتمی السعدی الانصاری (۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء تا ۹۷۳ھ/۱۵۶۶ء) کی

تصنیف ہے۔

(۱۲) نساخ کے چوتھے دیوان کا نام "ارمغانِ" ہے۔ یہ تاریخی نام ہے، جس سے اس کا سالِ تصنیف ۱۳۰۲ھ (۸۵-۱۸۸۴ء) برآمد ہوتا ہے۔ موجودہ صورت میں اس جملے کا درمیانی حصہ مبہم ہے۔ جو کچھ کہنا مقصود ہے، وہ زیادہ بہتر طور پر اس طرح کہا جا سکتا ہے: نساخ کے چوتھے دیوان "ارمغانِ" میں...

(۱۳) محمد عباس رفعت شروانی اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:

شوال ۱۲۹۸ھ میں خبر آئی کہ شہر اجمیر میں مولوی نجف علی مؤلفِ "سفرنگِ دساتیر" وفات پا گئے۔

(ص ۱۶۶، بحوالہ ماہ نامہ "شاعر"، بمبئی، جلد: ۵۲، شمارہ: ۵ و ۶، بابت: ۱۹۸۱ء، ص ۷۵)

مولوی صاحب کی پوتی روشن آرا بیگم پروین کی کہی ہوئی تاریخ:

آہ، پنہاں شد ز ہستی، یک بیک، مہرِ کمال

سے بھی ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) ہی برآمد ہوتا ہے۔

(۱۴) "ظا" = اند کے۔

(۱۵) ملاقات نہ ہونا ممکن ہے، لیکن فی مابین تعلقات نہ ہونا بعید از قیاس ہے۔ غالب "دافعِ ہذیان" کی تصنیف سے پہلے "سفرنگِ دساتیر" کی تقریظ لکھ چکے تھے۔ ممکن ہے کہ "دری کشا" کی تقریظ بھی پہلے ہی لکھی جا چکی ہو، اور اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے یہ تقریظیں کسی تعلق یا شناسائی کے بغیر لکھی ہوں گی۔

(۱۶) یہ کتاب بہ اہتمامِ سید فخر الدین، اکمل المطابع، دہلی، میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ فی الوقت سالِ طباعت کی تصدیق یا تردید ممکن نہیں۔ آخر میں درج قطعاتِ تاریخ میں سے تین سے اس کا سالِ اتمام ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء برآمد ہوتا ہے۔ آخری قطعے سے ۱۲۸۱ھ نکلتا ہے، لیکن اس سے پہلے یہ صراحت

موجود ہے کہ:

این نامہ پایانِ سالِ ہشتاد بہ انجام رسیدہ بود۔

غالب کی تقریظ ان قطعات سے پہلے درج ہے۔ اس لیے اسے بھی ۱۲۸۰ھ کے اواخر، یا ۱۲۸۱ھ کے اوائل، کی تحریر ہونا چاہیے۔

(۱۷) قاضی صاحب کا یہ احتراز اس احتیاط کے منافی ہے جس کا وہ تاعمر دوسرے محققین سے مطالبہ کرتے رہے۔

(۱۸) یہ تقریظ بھی "باغ" میں شامل ہے۔

حواشیِ نظمِ فارسی

(۱) یہ مثنوی "باغ" میں موجود ہے۔ دراصل یہ ایک منظوم خط ہے جو منشی جواہر سنگھ جوہر کو ان کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

(۲) "طا" ۔ یا اسد اللہ غالب۔

(۳) رائے چھج مل کا انتقال ۱۲۷۷ھ (۶۱-۱۸۶۰ء) میں ہوا۔ خود غالب کا کہا ہوا یہ قطعۂ تاریخِ وفات "باغ" میں موجود ہے:

گویند، رائے چھج ملِ شیریں کلام مُرد
ورنہ دوست رفت ازیں تنگنا، دریغ
گفتم: کے ز سال وفاتش نشاں دہد
غالب شنید و گفت: چہ گویم، بسا دریغ
(۱۲۷۷ھ)

(۴) "سے خانۂ آرزو سر انجام" ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء) میں مرتب ہوا تھا۔ غالب نے ایک خاص التزام کے ساتھ اس نام سے تاریخ نکالی تھی اور اسے اس طرح ایک رباعی میں نظم کیا تھا:

غالب ایں کارنامہ را نام بگو
"میخانۂ آرزو سر انجام" بگو
آحاد مگیر و از مآت و عشرات
تاریخِ قبول زیبِ اتمام بگو

یعنی اکائیاں چھوڑ کر صرف دہائیاں اور سیکڑے شمار کیے جائیں تو اس نام سے دیوان کی تاریخِ اتمام نکل آئے گی۔

(۵) جوہر کے نام کے تیرہ خط "باغ" میں موجود ہیں۔ یہ اب شائع ہو کر سامنے آ

چکے ہیں۔

(۶) "تلامذۂ غالب" میں ہے:

بروایتِ بشیر، غالباً ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔

(طبعِ ثانی، ص ۱۳۸)

(۷) سیاح کے نام سہ شنبہ، ۱۱ محرم ۱۲۷۷ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

تمھاری جان کی اور اپنے ایمان کی قسم کہ میں فنِ تاریخ گوئی و معما سے بیگانۂ محض ہوں۔

(۸) "لطا" ۔ م۔

(۹) ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ "سرِ آبلے" سے مراد "الف" نہیں ہے۔ "با"، بمعنی "آب"، مراد ہے جو "ک" اور "ل" کے بیچ آکر "کمال"، یعنی "بکمال"، ہو گیا۔

(ماہ نامہ "کتاب نما"، نئی دہلی، شمارہ: فروری ۱۹۹۶ء، ص ۱۵)

(۱۰) یہ رباعی "باغ" میں بھی موجود ہے (ص ۸۸)۔ قلابین میں درج لفظ وہاں بھی محذوف ہیں۔

(۱۱) بسمل کی تاریخِ وفات ۲۷ رمضان ۱۲۶۳ھ (۸ ستمبر ۱۸۴۷ء) ہے۔ انتقال کلکتے میں ہوا تھا، وہیں چوبیس پرگنہ کے کسی قبرستان میں دفن ہیں ("تذکرۂ مشاہیرِ کاکوری"، ص ۵۵)۔

(۱۲) ولادت بمقامِ کاکوری، ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء)۔ وفات بمقامِ کلکتہ، شنبہ، ۱۰ رمضان ۱۲۵۶ھ (۷ نومبر ۱۸۴۰ء)۔ عاشق علی خاں ۱۸۲۸ء کے شروع میں مولوی خلیل الدین کاکوروی کی جگہ اودھ کے سفیر مقرر ہوئے تھے۔ شوال ۱۲۴۴ھ/اپریل ۱۸۲۹ء میں انھوں نے اس منصب سے استعفا دے دیا تھا ("تذکرۂ مشاہیرِ کاکوری" صفحات: ۲۳۰ و ۲۳۱ و "نامہ"، مقدمۂ مرتب، ص ۳۹ و متنِ کتاب ص ۷۵)۔

حصۂ دوم

حواشیِ خطوطِ فارسی

(۱) نقل کردہ دونوں عبارتیں ایک ہی خط نمبر:۱۶ (ترتیبِ جدید: ۳۲/۱۶) سے تعلق رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ مقدم الذکر عبارت اصلاً موخر اور موخر الذکر عبارت مقدم ہے۔

(۲) مرزا احمد بیگ تپاں: قاضی صاحب کا ارشاد ہے کہ:

تپاں اور ان کے استاد [طپش] اپنا تخلص "ط" سے لکھتے تھے۔

اس صورتِ واقعہ کے علم کے باوجود اس کتاب میں ہر جگہ ان کا تخلص "ت" سے لکھا گیا ہے۔ چوں کہ یہ قاضی صاحب کا شعوری فیصلہ تھا، اس لیے ہم نے بھی اسے علیٰ حالہٖ برقرار رکھا، لیکن اصولی طور پر یہ طریقِ کار درست نہیں۔ کوئی شخص اپنا نام (تخلص بھی اسی ذیل میں آتا ہے) جس طرح لکھتا ہے اور جس انداز سے اس کا تلفظ کرتا ہے، دوسروں کو بھی اس کا اتباع کرنا چاہیے۔

(۳) نامعلوم الاسم مکتوب الیہ خواجہ محمد حسن ہیں۔ علاوہ بریں ان خطوط میں سے ایک خط مولوی علی اکبر خاں طباطبائی کے نام اور ایک مولوی سراج الدین احمد کے نام بھی ہے۔

(۴) نسّاخ (سخن) نے ان کے والد کا نام نواب عطاء اللہ خاں لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ غالب کے مکتوب بنام شیفتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام مرزا ہادی بیگ خاں تھا۔

(۵) احمد بخش خاں کے بڑے بھائی کا نام نبی بخش خاں تھا۔

(۶) اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

حالِ من سراسر بہ خدمت مرزا صاحب گزاردہ عرض می توان کرد کہ واللہ شمارا عمِ تحقیقی و بزرگِ معنویِ خویشتن می دانم۔

(۷) غالب ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ/۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے۔ اس مجموعے میں تپاں کے نام ۹ شعبان ۱۲۴۳ھ سے پہلے کے دو خط شامل ہیں۔ ان خطوط کے بے تکلفانہ انداز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان پہلے سے تعلقات موجود تھے۔

(۸) یہ بات جس خط کے حوالے سے کہی گئی ہے، وہ اصلاً مولوی سراج الدین احمد کے نام ہے۔ دراصل مولوی سراج الدین احمد ہی نے انھیں اپنے ساتھ قیام کی پیش کش کی تھی۔

(۹) یہ صاحب "خواجہ حاجی" کے نام سے معروف ہیں، انھیں مرزا حاجی" لکھنا کسی اعتبار سے درست نہیں۔ ایک بار تپاں نے انھیں "خواجہ حاجی خاں" لکھ دیا تھا، غالب نے اس کے جواب میں لکھا:

مرا خندہ در گرفت و حیرت از خودم برد کہ قطعِ نظر از استحقاق و عدمِ استحقاق خواجہ حاجی را خواجہ حاجی خاں مرحوم بہ کدام تمسک و کدام علاقہ تواں گفت۔ احمد بخش خاں... پیوستہ خواجہ حاجی نبشت و خواجہ حاجی گفت...

("مت"، ص ۱۰۲)

(۱۰) "ظا" = نامہ و پیغام با من مسدود کردہ اند۔

(۱۱) تجربہ شاہد ہے کہ تقویم کے تخمینی حساب اور رُویت کے مطابق اصل تاریخ میں کبھی کبھی دو دن کا فرق بھی ہو جاتا ہے۔

(۱۲) "متفرقات" میں تپاں کے نام کے چھبیس نہیں، صرف چھ خط شامل ہیں، لیکن مولوی سراج الدین احمد کے نام کے اکیس خطوط میں سے کم سے کم

ایک خط (نمبر: ۲) بھی دراصل انھی کے نام ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے: مرتّب کا مقالہ "متفرقاتِ غالب"، مشمولہ "غالب نامہ"، نئی دہلی، شمارہ: جنوری ۱۹۹۷ء)۔

(۱۳) "نگارستانِ سخن" (مؤلفہ نواب سید نورالحسن خاں) کا سالِ تصنیف ۱۲۸۳ھ نہیں، ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء ہے۔ یہ تذکرہ "شمعِ انجمن" (مؤلفہ نواب سید صدیق حسن خاں) کا تتمہ ہے۔ اس کا بڑا حصہ ان "شعراے معاصرین از ڈھاکہ و بنگالہ و غیرِ آں" کے تراجم پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنے "نتایجِ افکار" تذکرہ "شمعِ انجمن" میں اندراج کی غرض سے اس وقت بھیجے تھے جب کہ یہ طباعت کے آخری مرحلے میں تھا۔ اس طرح اس تذکرے کا آغاز ۱۲۹۲ھ کے اواخر میں اور اتمام ۱۲۹۳ھ کے آغاز میں ہوا۔ سالِ طباعت ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء ہے۔

(۱۴) "تواریخِ ڈھاکہ" میں ہے:

> شائق، خواجہ حیدر جہاں (کذا) ابنِ خواجہ خلیل اللہ، متخلص بہ شائق، شہر کے باشندوں میں سے آپ ایک معزز اور سر عبدالغنی (متوفی: ۲۴ اگست ۱۸۹۶ء) کے قرابت مندوں میں تھے، اور مرزا اسداللہ خاں غالب دہلویؒ سے بذریعہ خط و کتابت کے اپنے کلام کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ آپ کا مختصر سا دیوان جناب خواجہ محمد افضل کے کتب خانے میں موجود ہے (صفحات ۳۳۵و۳۳۶)۔

ایک دوسرے موقع پر جہاں خاندانِ نوابانِ ڈھاکہ کے "لائق اور باکمال اشخاص کا ذکر ہے، ان کا نام "خواجہ حیدر جان" بھی لکھا گیا ہے (ص ۲۵۳)۔

(۱۵) مؤلفِ "سراپا سخن" نے شائق کے والد کا نام "خواجہ خلیل الدین" لکھا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری تھی کہ یہ بیان بھی درست نہیں۔

(۱۶) مؤلف "سراپا سخن" نے شائق کو "باشندۂ ڈھاکہ، وارد دہلی" لکھا ہے۔ اس

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس وقت (مابینِ ۱۲۵۹ھ و ۱۲۶۹ھ) ان کا حال لکھ رہے تھے، اس وقت وہ دہلی میں وارد تھے۔ اس لیے اس معاصر بیان کو محض سرسری طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(۱۷) غالب کے قیامِ کلکتہ کے دوران شعبان ۱۲۴۴ھ / فروری ۱۸۲۹ء میں شائق بھی وہاں موجود تھے۔ خط نمبر: ۱۸/۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈھاکا واپس جاتے وقت غالب سے ملاقات نہیں کر سکے، اس کا انھیں افسوس تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کم از کم ایک بار دونوں کی ملاقات ضرور ہو چکی ہوگی۔

(۱۸) مؤلفِ "نگارستانِ سخن" کے بیان کے مطابق شعرائے بنگال کے حالات ۱۲۹۲ھ کے اواخر میں مولوی محمد شاہ صاحب، متوسّلِ نواب واجد علی شاہ اختر، نے ان کے والد نواب صدیق حسن خاں کی خدمت میں "شمعِ انجمن" میں اندراج کی غرض سے بھیجے تھے۔ اس پس منظر میں ان کے اس بیان سے کہ شائق کے انتقال کو چوبیس سال ہو چکے ہیں، یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا سالِ وفات ۱۲۶۸ھ / ۵۲-۱۸۵۱ء ہے۔

(۱۹) اس مجموعے میں شائق کے نام کے دو خطوط شامل ہیں۔

(۲۰) "پنج آہنگ" میں منشی محمد حسن کے نام کے کل تین خطوط شامل ہیں۔

(۲۱) خواجہ فیض الدین حیدر کی طرح خواجہ محمد حسن اور خواجہ فخر اللہ بھی غالباً خواجگانِ ڈھاکا ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بظاہر یہ دونوں ریاست حیدر آباد سے وابستہ تھے۔

(۲۲) "ظا" = یشوار او۔

(۲۳) متذکرہ لوگوں کے علاوہ ان خطوط میں نواب مہدی علی خاں (خطوط نمبر: ۱۹/۸ و ۲۲/۲۲) اور مرزا غلام حسین (خط نمبر: ۱۶/۲۵) کے نام بھی آئے ہیں۔

(۲۴) جیسا کہ اس سے قبل بھی بتایا جا چکا ہے، اس مجموعے کے خطوط میں سے

ایک خط مولوی سراج الدین احمد کے اور ایک نواب علی اکبر خاں کے نام بھی ہے۔

(۴۵) خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام ۱۸۶۴ء کے اس خط میں، جس کا قاضی صاحب نے حوالہ دیا ہے، غالب نے مولوی سراج الدین احمد کو "مخلصِ صادق الولا" لکھا ہے۔ سراج الدین اصلاً لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ قاضی صاحب نے "متفرقات" کے جن خطوط کی بنیاد پر کان پور سے وطنی نسبت کی طرف اشارہ کیا ہے، انھی میں سے ایک کے "پنج آہنگ" میں منقول متن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل وطن لکھنؤ تھا:

اگر بہ کان پور و از آں جا بہ لکھنؤ رسیدہ بہ عشرت کدۂ خویش آرمیدہ اید۔

علاوہ بریں ۴ جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے منشی شیو نرائن آرام کو یہ ہدایت دیتے ہوئے کہ "دستنبو" کی ایک جلد مولوی سراج الدین احمد کو بھی بھیج دی جائے، ان کا پتا اس طرح لکھا ہے:

در لکھنؤ بہ احاطۂ خانساماں، متصلِ تکیہ شیر علی شاہ، بہ مکاناتِ مولوی عبدالکریم مرحوم بہ خدمتِ مولوی سراج الدین احمد صاحب برسد۔

اندازہ یہ ہے کہ مولوی سراج الدین احمد اس زمانے میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔

(۴۶) مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالب کے اس بیان سے کہ:

قدومی مولوی سراج الدین احمد برادرزادۂ مولوی عبدالکریم اند۔ ("نامہ"، ص ۸۸)

دونوں کے درمیان رشتۂ قرابت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مولوی خلیل الدین خاں کا ذکر "متفرقات" کے دو خطوط (نمبر: ۸ اور ۱۰) میں ان کے نام کے ساتھ آیا ہے۔ ان دونوں خطوں میں، ان کی "صحت" اور "ترقی درحالِ

خیر اشتمال" پر اظہارِ اطمینان کیا گیا ہے۔ اسی مجموعے کے دو خطوں (نمبر: ۷ اور ۹) میں کسی "مولوی صاحب قبلہ" کی "ناسازیِ مزاج" پر اظہارِ تشویش اور "بعارضۂ بواسیر" کافی تکلیف اٹھانے کے بعد اس "زحمت سے راحت" پانے کا تذکرہ بھی بہ گمانِ غالب انھی مولوی خلیل الدین خاں سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دونوں خطوں میں سے پہلے خط کا یہ بیان کہ:

شما و عمِ بزرگوارِ شما از گراں مایگانِ دہر و نیکوانِ روزگارید،

مولوی سراج الدین احمد اور مولوی خلیل الدین کے درمیان قریبی خونی رشتے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مولوی خلیل الدین منشی عاشق علی خاں سے پہلے کلکتے میں شاہِ اودھ کے وکیل تھے۔ وہ ۱۸۲۷ء کے اواخر، یا ۱۸۲۸ء کے اوائل، تک اس عہدے پر منصوب رہے ("نامہ"، مقدمۂ مرتبہ، حاشیہ، ص۳۹)۔

(۲۷) یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ سراج الدین احمد کلکتے سے "آئینۂ سکندر" کے نام سے ایک اخبار بھی نکالتے تھے۔ ان کے نام غالب کے کئی خطوط میں اس اخبار کا ذکر آیا ہے، لیکن اہلِ علم اس اخبار سے ان کے تعلق کے معاملے میں عام طور پر بے یقینی کا شکار رہے ہیں، مثلاً "بزم" کے مصنف کے بقول، اس اخبار سے ان کا کوئی تعلق تھا یا نہیں، وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے (ص۹۱)۔ اب جناب گربچن چندن کی تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ اخبار ۱۸۳۱ء میں جاری ہوا تھا اور مولوی سراج الدین احمد اس کے ایڈیٹر تھے ("جامِ جہاں نما"، ص۲۱۶)۔

(۲۸) مصرعِ ثانی کا متداول متن اس طرح ہے:

ورنہ غالب نیست آہنگِ غزل خوانی مرا

(۲۹) اصلاً ان دونوں مجموعوں میں چودہ (۱۴) خطوط مشترک ہیں۔

(۳۰) یہ خط اگست ۱۸۶۴ء کا ہے۔ غالب نے لکھا ہے:

بھائی ابھی قطب سے نہیں آئے۔ "دافعِ ہذیان" کے دو

مجلد اور بھیج دوں گا۔

"بھائی" سے نواب ضیاء الدین احمد خاں مراد ہیں جو اس سے قبل کے خط کے مطابق پھول والوں کے میلے میں شرکت کے لیے قطب صاحب گئے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں یہ میلا "بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا" تھا۔ "دافعِ ہذیان" مئی ۱۸۶۴ء میں زیرِ تصنیف تھا (مکتوب موسومہ علائی، مؤرخہ ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء)۔ چوں کہ ۱۸۶۴ء میں بھادوں کا مہینا اگست میں پڑا تھا، اس لیے یہ خط بالیقین اگست ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا ہے۔

(۳۱) مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

> یہ مولوی عبدالقادر خاں غمگین رام پوری متوفی: رجب ۱۲۶۵ھ (مئی ۱۸۴۹ء) کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے، جسے موصوف نے فارسی زبان میں مرتب کیا ہے۔ چوں کہ اس کی ترتیبِ واقعات تاریخ وار ہے، اس لیے اسے "روزنامچہ" کہا گیا ہے۔ یہ روزنامچہ بہت دل چسپ، کار آمد اور شروع انیسویں صدی عیسوی کے متعدد اہم واقعاتِ تاریخی کے چشم دید حالات پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں مختلف مقامات کے علما و ادبا کے حالات اور متعدد علمی و لسانی مباحث بھی اس میں جستہ جستہ مذکور ہیں، جس کے سبب سے اس کی افادی حیثیت دوبالا ہو گئی ہے۔

("دستور الفصاحت"، دیباچہ، ص ۹۳ و ۹۴)

(۳۲) عبدالرؤف عروج کے بقول:

> بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم خاں کلکتے سے دہلی آ کر وقائع نگارِ سلطانی ہو گئے تھے اور ہیضے کی وبا میں (وہیں) ۱۲ دسمبر ۱۸۳۵ء کو انتقال کیا۔

("بزم"، ص ۲ و ۳)

لیکن ڈاکٹر نادر علی خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۰ جولائی ۱۸۴۱ء کو جب دہلی سے فارسی کا پہلا اخبار "سراج الاخبار" جاری ہوا تو ابوالقاسم خاں زندہ تھے۔

یہ اخبار مطبعِ سلطانی میں بہ اہتمامِ مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں وقائع نگار و امداد علی بیگ خاں چھپ کر شائع ہوتا تھا۔

("اردو صحافت کی تاریخ"، ص ۱۳۴)

اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نمبا سید تھے۔ عروج نے بھی ان کا پورا نام، مع خطاب، مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں ہی لکھا ہے (ص ۱)۔

(۳۳) یہ بہن عمر میں غالب سے بڑی تھیں اور ان کا نام چھوٹی خانم تھا۔

(۳۴) مرزا اکبر بیگ جہانیاں جہاں گشت قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ مصر اور دوسرے کئی ممالک کی بھی سیاحت کی تھی اور حجِ بیت اللہ کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے تھے ("بزم"، ص ۴۵)۔

(۳۵) "نامہ" میں شامل ایک خط، مرقومہ: ۱۳ جون ۱۸۲۸ء، سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل بیگ غالب کے کلکتے پہنچنے کے فوراً بعد ہی سے ان کی مخالفت و قاصت پر کمر بستہ تھے۔ غالب اس خط میں لکھتے ہیں:

افضل بیگ نام یارے از یاران و معاشران و ہم صحبتانِ راقم (کہ) بہ صیغۂ وکالت از جانب اکبر شاہ (ثانی) دریں دیار رسیدہ بود... از آنجا کہ... برادر زنِ خواجہ حاجی است... با من عداوت ہائے نہانی ورزید و مرا در تمیعِ اہلِ تسنن بہ رفض و غلو و در لامیہ بہ تصوف و الحاد و زندقہ (متہم گردانید)

(ص ۳۸)۔

(۳۶) مرزا افضل بیگ ۱۷ رمضان ۱۲۴۵ھ (۱۲ مارچ ۱۸۳۰ء) کو کلکتے سے دہلی

پہنچے اور اکبر شاہ ثانی نے انھیں "خطابِ خانی و مقرب الدولگی" عطا فرمایا۔
اس کے بعد پورا نام ہوا، "مقرب الدولہ افضل بیگ خاں بہادر۔" دہلی میں
ورود کے دن سے ہی ان کی بیماری اور "عارضۂ تپِ دق و سرفہ وسعال" میں
گرفتاری کا سلسلہ شروع ہو گیا ("کلیاتِ نثرِ غالب"، مطبوعہ ۱۸۷۱ء،
ص ۱۳۱)۔ اسی بیماری میں چہار شنبہ، ۲۳ صفر ۱۲۴۷ھ مطابق ۳ اگست
۱۸۳۱ء، سے کچھ پہلے ان کی وفات ہوئی ("ت"، ص ۹۴)۔ یہ امر بھی قابلِ
ذکر ہے کہ مرزا افضل بیگ ہی کی سفارش پر اکبر شاہ ثانی نے بنگال کے
مشہور سماجی مصلح رام موہن رائے کو "راجا" کا خطاب عطا کیا تھا اور بعض
تصفیہ طلب امور کی یک سوئی کے لیے اپنا پیروکار اور سفیر بنا کر لندن بھیجا
تھا۔ تاریخِ روانگی ۱۵ نومبر ۱۸۳۰ء ("غالب نامہ"، نئی دہلی، شمارہ: ۳ و ۴،
۱۹۷۶ء، ص ۱۶۵)۔

(۳۷) علی اکبر خاں کے والد کا نام سید علی تقی تھا۔ یہ تقریباً ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹-۳۰ء
میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے ("بزم"، ص ۳۶)۔

(۳۸) سراج الدین علی خاں کا اصل وطن موہان، ضلع اناؤ، تھا۔ عروج نے ان کا
سالِ وفات ۱۲۴۴ھ لکھا ہے ("بزم"، ص ۱۹۹)، جب کہ سید اکبر علی
ترمذی ان کے انتقال کو ۱۲۳۸ھ/۲۳-۱۸۲۲ء کا واقعہ قرار دیتے ہیں
("نامہ"، مقدمۂ مرتب، حاشیہ، ص ۲۵)۔ یہ امر بہر حال طے شدہ ہے کہ وہ
غالب کے کلکتے پہنچنے (۴ شعبان ۱۲۴۳ھ/۱۹ فروری ۱۸۲۸ء) سے پہلے
وفات پا چکے تھے۔ غالب نے کلکتے پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ہی ان کے مزار پر
حاضری دی تھی۔ ("نامہ"، ص ۳۰) ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں جب اس مزار
کے قریب امام باڑے اور مسجد کی تعمیر ہوئی تو غالب نے ان دونوں کی
تاریخیں کہیں (ایضاً، ص ۸۴ و ۸۵)۔

(۳۹) تین بار کی یہ حد بندی مناسب نہیں۔ غالب جون ۱۸۲۸ء کے خط میں
محمد علی خاں کو لکھتے ہیں:

بندہ سہ بار در ہوگلی رفتہ و لذت ہا از صحبتِ آں بزرگ

برداشتہ۔ ("نامہ"، ص ۳۷)

اس کے بعد چودہ مہینے کے قیامِ کلکتہ کے دوران یقین ہے کہ غالب مزید کئی بار ہوگلی گئے ہوں گے۔ مارچ ۱۸۲۹ء کے شروع میں نواب صاحب کی عیادت کے لیے ہوگلی جانے اور پانچ روز وہاں قیام کرنے اور دہلی کے لیے واپسی کے سفر سے قبل بھی پانچ روز ان کے ہاں مہمان رہنے کا ذکر مختلف خطوں میں موجود ہے ("نامہ"، ص ۷۱ و "مت"، ص ۱۱۷)۔

(۳۰) مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ ۱۸۱۱ء میں ایک کلرک کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ ۲۱ جون ۱۸۱۴ء کو انھیں دہلی کے ریزیڈنٹ کا معاون (اسسٹنٹ) مقرر کیا گیا۔ یکم مارچ ۱۸۲۴ء کو مرکزی گورنمنٹ کے پرشین سیکریٹری اور پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکریٹری بنائے گئے۔ گورنر جنرل کے شمال مغربی ہندوستان کے دورے کے موقع پر وہ ۶ جولائی ۱۸۲۶ء کو ان کے پرشین سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی منصب پر کارگزاری کے دوران ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو کلکتے میں ان کی وفات ہوئی ("نامہ"، مقدمۂ مرتب، حاشیہ، ص ۳۶)۔

غالب مسٹر اسٹرلنگ کو اپنا ہم درد اور بہی خواہ سمجھتے تھے، چناں چہ مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں انھوں نے ان سے کافی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان کی بےوقت موت کی وجہ سے یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں۔ اس حادثۂ ناگہانی پر غالب نے کئی جگہ اظہارِ افسوس کیا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے بصورتِ قطعہ ایک مرثیہ بھی کہا تھا جس کے واقعاتی نوعیت کے تین شعر درج ذیل ہیں:

بہ صد نشاط سی و ہنج سالہ از دنیا

جریدہ رفت و جوانان چنیں، روند چنیں

بہ روزِ بست و سوم از مئی بہ ہنگامہ
کہ بود خسروِ انجم بہ بُرجِ ثور مکیں
ہزار و ہشت صد و سی ز عہدِ عیسیٰ بود
کہ جست برقِ جہاں سوزِ ایں الم ز کمیں

(۴۱) یہ اتفاق ہے کہ دوسرے کئی مکتوب الیہم کی طرح ان کے نام کا کوئی خط بھی دست یاب نہیں، لیکن قیامِ کلکتہ کے دوران غالب کے اور ان کے درمیان خط و کتابت رہی تھی، اس کا علم قاسم کے نام کے ایک خط کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ:

مکتوبے بہ نامِ نامیٔ آغا صاحب رقم زدہ در نوردِ عرض داشت فرستادہ است، مترصد کہ سر تا پائے آں نگرستہ، بہ مکتوب الیہ سپارند۔ ("مت"، ص ۱۱۶)

(۴۲) حکیم صادق علی خاں اکبر شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ تھے۔ وہ فنِ طب سے متعلق متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۲۹ صفر ۱۲۶۴ھ (۵ فروری ۱۸۴۸ء) کو اسی سال کی عمر میں وفات پائی ("حیاتِ اجمل"، ص ۱۰ و ۱۱)۔ ان کے بیٹوں میں حکیم غلام محمود خاں نے کافی نام کمایا۔ مثنوی "ابرِ گہر بار" کی تقریظ میں بالواسطہ طور پر حکیم صادق علی خاں کا نام اس طرح آیا ہے:

سعادت و اقبال نشاں، حکیم غلام رضا خاں ابنِ عالی جاہ حکیم مرتضیٰ خاں ابنِ فرزانۂ یگانہ حکیم محمد صادق علی خاں مرحوم مثنوی "ابرِ گہر بار" را پیرایۂ الطباع ارزانی داشت۔

(۴۳) حکیم سید احمد علی خاں یکتا، صاحب "دستور الفصاحت"، لکھنؤ میں مرزا فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر (متوفی: ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) اور ان کے بعد ان کے بیٹے مرزا قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی قمر کی سرکار سے وابستہ رہے ("دستور الفصاحت"، دیباچۂ مصحح، ص ۷)۔ جب آغا میر کے عروج

کے ساتھ مرزا حاجی کا زوال شروع ہوا اور وہ شہر بدر کیے گئے (۱۱ ربیع الثانی ۱۲۳۴ھ/۱۷ فروری ۱۸۱۹ء) تو ممکن ہے یکتا بھی ان کے ساتھ لکھنؤ سے نکلے ہوں اور انھوں نے کچھ دن اِدھر اُدھر گزار کر یا پھر براہِ راست کلکتے کا رخ کیا ہو جو اس زمانے میں ہر صاحبِ علم طالع آزما کا مرکزِ نگاہ بنا ہوا تھا۔

(۴۴) محمد علی کی مکتب نشینی کی تقریب ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ کو منعقد ہوئی تھی۔ اگر یہ رسم حسبِ دستور چار برس چار ماہ چار دن کی عمر میں ادا کی گئی ہوگی تو وہ ۴ ربیع الثانی ۱۲۳۹ھ (۸ دسمبر ۱۸۲۳ء) کو پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس حساب سے تپاں کے انتقال کے وقت ان کی عمر سوا آٹھ سال سے زائد نہ ہوگی۔

(۴۵) خواجہ محمد وزیر، شاگردِ ناسخ، متوفی: ۴ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۸۵۵ء۔

(۴۶) "مآثرِ غالب" کی اشاعت کے آخری مرحلے میں قاضی صاحب نے "التماس" کے تحت ان تین افراد میں سے نواب مہدی علی خاں کے بارے میں اس اطلاع کا اضافہ فرمایا ہے کہ:

> علی اکبر خاں صاحب "سیر المتاخرین" (غلام حسین طباطبائی) کے حقیقی بھتیجے تھے اور مہدی علی خاں موخرالذکر کے ایک پوتے کا نام تھا۔ عجب نہیں، غالب کے خط میں انھیں کا ذکر ہو۔

گویا اس کا قوی امکان ہے کہ مہدی علی خان نواب علی اکبر خاں کے بیٹے، یا ان کے بھتیجے، ہوں۔

خواجہ محمد مستقیم کے بارے میں اب عبدالغفور خاں نساخ کی خود نوشت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ ہوگلی کے سرکاری مدرسے میں مدرّس تھے اور نساخ کی قیام گاہ کے قریب محلہ جوڑا گھاٹ میں رہتے تھے۔ خواجہ صاحب فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور ۱۸۴۷ء تک، جب کہ نساخ بغرضِ

تعلیم ہو گئی پہنچے ہیں، بقیدِ حیات اور برسرِ ملازمت تھے ("خود نوشت سوانحِ حیاتِ نساخ"، ص ۷ و ۸)۔ راو شیو راو ہنوز بدستور مجہول الاحوال ہیں۔

(۴۷) معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر خاں ذوالفقار جنگ، معروف بہ حسین مرزا و ملقب بہ ناظر جی، ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں ان سے چودہ برس بڑے تھے۔ گویا وہ تقریباً غالب کے ہم عمر تھے۔

(۴۸) نامی اپنی علاتی والدہ کے سلوک سے بددل ہو کر لکھنؤ سے دلّی چلے آئے تھے۔ یہاں شاہانِ اودھ کی املاک کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ اس طرح دلّی میں رہتے ہوئے بھی دربارِ اودھ سے ان کی وابستگی برقرار تھی، چناں چہ کبھی کبھی وہ لکھنؤ جاتے بھی رہتے تھے۔

(۴۹) منشی محمد محسن دفترخانۂ فارسی میں نائبِ میر منشی تھے۔ مولوی عبدالکریم کی غیر موجودگی میں میر منشی کے فرائض وہی انجام دیتے تھے ("نامہ"، مقدمۂ مرتّب، حاشیہ، ص ۳۹)۔

(۵۰) مرزا علی لطف کے ممدوح کا اصل نام سیّد ابوالقاسم اور لقب میر عالم خاں تھا۔ وہ مشہور شیعہ فقیہ اور عالم سیّد رضی حسینی الجزائری کے بیٹے تھے۔ ان باپ بیٹوں کا شمار حیدر آباد کے ممتاز ارکانِ حکومت و سیاست اور بڑے جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔ سیّد ابوالقاسم آصف جاہِ ثانی میر نظام علی خاں کے عہد میں ان کے سپہ سالار رہے۔ بعد ازاں آصف جاہِ ثالث میر اکبر علی خاں کے دوسرے سالِ جلوس میں جب اعظم الدولہ ارسطو جاہ کا انتقال ہو گیا (۲۸ محرم ۱۲۱۹ھ/۹ مئی ۱۸۰۴ء) تو ان کی جگہ وزیرِ اعظم مقرر ہوئے۔ ۱۸۰۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔ حیدر آباد میں میر عالم کی ڈیوڑھی، اور میر عالم کا تالاب، انھی کی طرف منسوب ہے۔ خط نمبر: ۲۹/۱۴ میں جن نواب سیّد عالم علی خاں کا ذکر آیا ہے اور بعد ازاں خط نمبر: ۳۲/۱۶ میں "سیّدِ عالم سمجھ کر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ نواب منیر الملک ثانی

(متوفی ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۳ء) کے بیٹے اور غالب کے ممدوح اور مکتوب الیہ نواب مختار الملک میر تراب علی خاں سالار جنگ کے چچا تھے۔ ان کا لقب سراج الملک تھا۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء سے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء تک اور ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء سے ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء تک دو بار وزیر اعظم رہے۔ ۱۷ شعبان ۱۲۶۹ھ/۲۶ مئی ۱۸۵۳ء کو جب ان کا انتقال ہو گیا تو میر تراب علی خاں ان کی جگہ وزیر اعظم مقرر ہوئے اور "سالار جنگ" کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ خط نمبر: ۳۲/۱۶ میں صنعتِ تعطیل میں لکھی ہوئی جس نثر کا حوالہ ملتا ہے، خیال یہ ہے کہ وہ وزیر اعظم نواب منیر الملک کی وفات کے بعد ان کی جگہ میر عالم علی خاں کے تقرر کے امکان کو ملحوظ رکھ کر بہ امیدِ قدردانی ان کی خدمت میں ارسال کی گئی ہوگی۔ میر عالم اور سید عالم علی خاں کے درمیان نانا اور نواسے کا رشتہ تھا۔ میر عالم کی دو صاحب زادیاں نفیسہ بیگم اور صاحب بیگم یکے بعد دیگرے عالم علی خاں کے والد منیر الدولہ علی زماں خاں منیر الملک ثانی سے منسوب ہوئیں۔ صاحب بیگم کے بطن سے پہلے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں میر محمد علی خاں (شجاع الدولہ سالار جنگ) پیدا ہوئے۔ بعد ازاں میر عالم علی خاں (سراج الملک)، کی ولادت ہوئی۔

(۵۱) لارڈ ولیم کونڈش بنٹنک نے جولائی ۱۸۲۸ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنا منصب سنبھالا اور تقریباً چھ سال آٹھ مہینے کے بعد بوجہِ علالت مستعفی ہو کر ۲۰ مارچ ۱۸۳۵ء کو لندن روانہ ہوئے۔

(۵۲) ایڈورڈ کولبروک جولائی ۱۸۲۷ء میں دہلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ ۳۰ جون ۱۸۲۹ء کو انھیں بد عنوانی کے الزام میں معطل کیا گیا۔ اکتوبر ۱۸۲۹ء میں فرانسیس ہاکنس نے ان کی جگہ کارگذار ریزیڈنٹ کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ بعد ازاں ۲۹ دسمبر ۱۸۲۹ء کو کولبروک ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ غالب نے اپنے خطوط میں:

حاکمِ معزول، مشکفِ زاویہ خمول و فرماں دہِ حالِ لاابالی مزاج

ونا مطمئن ("نامہ"، ص ۹۳)

اور

حاکم معزول.خود مشغول و منصوب شہر آشوب

("ست"، ص ۳۶)

سے انھی دونوں حکام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۵۳) "ظا" ۹۴۳۰ھ۔

(۵۴) غالب سہ شنبہ، چہارم شعبان ۱۲۴۳ھ، مطابق ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء، کو کلکتے پہنچے تھے ("نامہ"، ص ۳۶)۔

(۵۵) باندا پہنچنے کی صحیح تاریخ جمعہ، یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۴۵ھ، مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء، ہے ("ست"، ص ۱۱۹ و "نامہ"، ص ۹۰)۔

(۵۶) کلکتے سے واپسی کا سفر صفر ۱۲۴۵ھ کے تیسرے ہفتے (اگست ۱۸۲۹ء، ہفتۂ سوم) میں شروع ہوا تھا ("ست"، ص ۱۱۷ و "نامہ"، ص ۸۷)۔

(۵۷) خط: ۱۲/۷ کا شادیٔ بسم اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

(۵۸) خط: ۱۳/۳ میں جشنِ کتب نشینی میں شرکت کے بعد صبح کے وقت ہوگلی روانہ ہونے اور "دو روز و دو شب" وہاں قیام کر کے دوشنبے کی شام کو واپس آنے کا تذکرہ ہے۔ مولوی محمد علی خاں کے نام کے ایک خط کے مطابق غالب کلکتے میں ورود کے بعد دو روز آرام کر کے پہلی بار ۶ شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۱ فروری ۱۸۲۸ء) کو ہوگلی گئے تھے۔

بعد دو روز کہ دوبارہ [اتفاق] جیت افتاد، دو روز و یک شب

صحبت با ماند۔ ("نامہ"، ص ۲۷)

ایک روز صبح کے وقت جا کر دوسرے دن شام کو واپس آنے کی صورت میں خط: ۱۳/۳ میں بھی "دو روز و دو شب" کی بجائے "دو روز و یک شب" ہونا چاہیے۔ چوں کہ یہ خط ہوگلی سے واپسی کے دوسرے روز لکھا گیا ہے، اس لیے دونوں مواقع پر بیان کردہ واقعات میں مطابقت کی بنا پر

جمعہ/سہ شنبہ، ۱۱ شعبان ۱۲۴۳ھ، مطابق ۲۶ فروری ۱۸۲۸ء کی تحریر ہے۔ یہ خط: ۲/۱ روزِ ورودِ کلکتہ (۴ شعبان، مطابق ۱۹ فروری) اور روزِ انعقادِ جشن (۸ شعبان، مطابق ۲۳ فروری) کے مابین لکھا گیا ہے۔

(۵۹) یہ خط بالیقین خط نمبر: ۱/۱۲ کے بعد، اور ۳/۱۲ سے پہلے، لکھا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جشنِ مکتب نشینی سے ایک دن پہلے، یعنی ۷ شعبان، مطابق ۲۲ فروری کو لکھا گیا ہو۔

(۶۰) خط میں "محفلِ مشاعرہ آئندہ" تک استظار کا ذکر ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کی کسی محفلِ سخن میں غالب پر اعتراضات کیے جا چکے ہیں۔ چوں کہ اس سلسلے کا پہلا مشاعرہ "یکشنبہ، ہشتم ماہِ جون" ۱۸۲۸ء، (۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۳ھ) کو ہوا تھا ("نامہ"، ص ۴۰) اور غالب نے اپنے معترضین کو جوابات "صحبت سیوم" میں دیے تھے (ایضاً، ص ۱۰۵) جو از روے حساب یکشنبہ، ۳ اگست ۱۸۲۸ء کو منعقد ہوئی ہوگی (مشاعرہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ہوتا تھا)، اس لیے اس خط کو دوسرے مشاعرے (۶ جولائی) کے بعد اور تیسرے مشاعرے (۳ اگست) سے قبل کی تحریر ہونا چاہیے۔

(۶۱)، (۶۲) خط نمبر: ۵/۲۱ اور ۶/۲۳ باہم مربوط ہیں۔ موخرالذکر میں مکتوب الیہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے نام کا رقعہ بغور پڑھنے اور بیاض میں نقل کر لینے کے بعد ضائع کر دیں۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ جس رقعے کو ضائع کر دینے کا مشورہ دیا گیا ہے، وہ اس سے اگلا خط نمبر: ۷/۲۳ ہو سکتا ہے۔ قرائن کے اعتبار سے یہ دل کو لگتی ہوئی بات ہے۔ چوں کہ خط نمبر: ۷/۲۳، ۳ اگست ۱۸۲۸ء کے بعد کی کسی تاریخ کا لکھا ہوا ہے، اس لیے ان دونوں خطوں کو بھی اسی زمانے کی تحریر ہونا چاہیے۔ خط نمبر: ۵/۲۱ میں تپاں کے ملازم جانو کو نیچہ بند کے لیے ضروری ہدایات دینے کی غرض سے بلایا گیا ہے۔ خط نمبر: ۶/۲۳ میں جانو کی "بے پروائی" کا شکوہ کرتے

ہوئے نیچہ بند کو جانو کے اور جانو کو خدا کے سپرد کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ ان خطوں کے درمیان تقدیم و تاخیر کا فیصلہ انھی اشارات پر مبنی ہے۔ خط نمبر: ۵/۲۱ میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ:

امروز این وقت سوارہ بہ اتالی می روم۔

غالب اتالی قاضی سراج الدین موجد مرحوم کی بیگم، یا مولوی ولایت حسن، سے ملنے جایا کرتے تھے۔ مولوی محمد علی خان کے نام کے مکتوب، مؤرخہ ۹ صفر ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۸۲۸ء، سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تحریر سے دو ایک روز پہلے غالب ان کی خیریت معلوم کرنے کی غرض سے بحالتِ اضطرار مولوی ولایت حسن سے ملنے گئے تھے ("نامہ"، ص ۳۳)۔ ان شواہد کی بنیاد پر اس خط کا زمانۂ تحریر صفر ۱۲۴۴ھ کا ہفتۂ اول قرار پائے گا۔

(۶۳) اس خط میں جن دو شعروں پر اعتراضات کے حوالے دیے گئے ہیں، ان میں سے دوسرا شعر (... سر خواں زدہ) جس غزل سے تعلق رکھتا ہے وہ تیسرے مشاعرے، منعقدہ: ۳ اگست ۱۸۲۸ء، میں پڑھی گئی تھی ("نامہ"، ص ۱۰۶)۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط ۳ اگست ۱۸۲۸ء کے کچھ دنوں بعد لکھا گیا ہوگا۔

(۶۴) خط: ۶/۲۳ میں محمد علی (فرزند تپاں) کی "خیر و عافیت" مطلوب تھی۔ اس خط میں بھی محمد علی اور اس کے بھائی کی علالت پر فکرمندی کا اظہار کیا گیا ہے، اس لیے خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

(۶۵) یہ خط مکتوب نمبر: ۱۰/۱۱ سے پہلے، لیکن اسی روز، لکھا گیا ہے۔

(۶۶) اس خط میں "گلِ رعنا" کا ذکر آیا ہے۔ یہ مجموعہ از روئے مقدمہ غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ (۱۲ ستمبر ۱۸۲۸ء) کو مکمل ہوا تھا، اس لیے اس خط کو اس کے بعد کی تحریر ہونا چاہیے۔ اس پہلے خط (۹/۲۰) میں اخبار "جامِ جہاں نما" طلب کرنے کا مقصد "حالِ رزیڈنٹ دہلی" کی دریافت بتایا گیا ہے۔ مولوی

محمد علی خاں کے نام کے ایک خط، مؤرخۂ ۲۸ رجب ۱۲۴۴ھ (۳ فروری ۱۸۲۹ء) کا یہ اندراج کہ:

> شنیدہ می شد کہ آخرِ جنوری رزیڈنٹ بہ دہلی معاودت خواہد کرد ("نامہ"، ص۶۱)،

یہ ظاہر کرتا ہے کہ غالب کو یہ بات کم از کم شروعِ جنوری تک ضرور معلوم ہو گئی ہوگی۔ اس اعتبار سے ان دونوں خطوں کو جنوری ۱۸۲۹ء (رجب ۱۲۴۴ھ) کی تحریر قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۶۷) لارڈ صاحب کے حضور میں باریابی اور سراج الدین احمد کے ہاں مسلسل دو بار کی شب بسری مرزا ابوالقاسم خاں کے نام کے خط نمبر: ۳۶ اور محمد علی خاں کے نام کے مکتوب، مؤرخۂ ۱۷ فروری ۱۸۲۹ء، مطابق ۱۳ شعبان ۱۲۴۴ھ، کے بموجب ۱۵ اور ۱۶ فروری کے واقعات ہیں ("مت"، ص۱۱۱، "نامہ"، ص۶۹)۔ اس پس منظر میں اس خط کی تاریخِ تحریر ۱۶ فروری ۱۸۲۹ء، مطابق ۱۲ شعبان ۱۲۴۴ھ قرار پاتی ہے۔

(۶۸) اس خط میں مذکور "بزمِ طرب" سے وہ محفل مراد ہے جو تپاں کے زیرِ اہتمام چہار شنبے کے دن منعقد ہوتی تھی۔ خطوط نمبر: ۲،۱۱ و ۲۱۴ میں مذکور جشنِ کمتب نشینی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ زیرِ بحث خط میں نواب علی اکبر خاں کی علالت اور ان کی عیادت کے لیے ہوگلی جانے کے قصد کا ذکر بھی آیا ہے۔ مکتوب موسومۂ مولوی محمد علی خاں، مؤرخۂ سہ شنبہ، چہارمِ رمضان ۱۲۴۴ھ، میں نواب صاحب موصوف کے سلسلے میں غالب کا بیان ہے کہ:

> از تحریرِ ممدوحی پدید آمد کہ بیمار اند... بہ عیادت رفتم و پنج روز و شب در ہوگلی بسر بردم... دیروز بر گردیدہ بہ زاویۂ ناکامیِ خویشتن رسیدم۔ ("نامہ"، ص۷۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب چہار شنبہ، ۲۸ شعبان کو ہوگلی گئے

ہوں گے۔ یہ خط اس سے پانچ روز پہلے، یعنی جمعہ ۲۳ شعبان، مطابق ۲۷ فروری ۱۸۲۹ء، کو لکھا گیا ہے۔

(۶۹) اس خط میں جس "مکتوب، موسومہ خواجہ فیض الدین حیدر صاحب" کا ذکر آیا ہے وہ مکتوب نمبر: ۱۸/۲۷، مؤرخہ ۲ رمضان (۱۲۴۴ھ) ہے۔ یہ خط بھی اسی تاریخ کا لکھا ہوا ہے۔

(۷۰) "طا" = ممکن ہے، خط: ۳ خط: ۳۱ ہو۔

(۷۱) اس خط میں غالب نے مکتوب الیہ سے کچھ رقم بطورِ قرض طلب کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ:

ہر چہ مطلوبست، پیش از عید یکشت بہ من برسد۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ خط ماہِ رمضان کا لکھا ہوا ہے۔ رمضان ۱۲۴۳ھ میں غالب کو کوئی مالی پریشانی لاحق نہ تھی۔ مولوی محمد علی خاں کو ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۴۳ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

شعبان و رمضان و شوال و ذیقعدہ گذشت، اینک ذی الحجہ رسیدہ است، اگر [بلاے] از فلک نریزد، تا دو ماہِ دیگر از فکرِ روزی فارغم۔ ("نامہ"، ص ۳۱)

اس کے برخلاف ۳ رمضان ۱۲۴۴ھ کے خط میں اپنے "اندوہِ تہی دستی" کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

رمضان رسیدہ و توشہ سپری گردیدہ۔ (ص ۴۷)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خط رمضان ۱۲۴۴ھ میں لکھا گیا ہے۔ خط میں جس محفل کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ بدھ کے دن منعقد ہوتی تھی اور اس بیان سے کہ:

امروز بہ محفل باید رسید،

یہ ظاہر ہے کہ یہ خط بدھ ہی کے دن لکھا گیا ہے۔ علاوہ بریں اس کا عید سے قریب تر کسی تاریخ میں لکھا جانا معلوم ہے۔ ان تمام شواہد کے پیشِ نظر اس

کی تاریخِ تحریر، چہار شنبہ، ۲۶ رمضان ۱۲۴۴ھ متعین کی جا سکتی ہے۔ اس تفصیل کے بعد قاضی صاحب کے باقی قیاسات پر اظہارِ خیال ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

(۷۲) اس خط میں جس "نیاز نامہ، موسومۂ جناب فیض الدین حیدر صاحب" کا ذکر آیا ہے، وہ مکتوب نمبر: ۲۸/۳۱ ہے جو بروز جمعہ، ۶ صفر ۱۲۴۵ھ لکھا گیا ہے۔ یہ خط بھی اسی تاریخ کا لکھا ہوا ہے۔ خط کے ایک اور بیان:

دوشالۂ سبز کہ پریشب از طرناں آوردہ بودم،

سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالب یہ دوشالہ تپاں کے ہاں کی محفل سے واپسی کے وقت لے کر آئے ہوں گے۔ اس لحاظ سے بھی اس خط کا محفل کے تیسرے دن، یعنی بروزِ جمعہ، لکھا جانا ثابت ہوتا ہے۔

(۷۳) مکتوب بنام مولوی محمد علی خاں، مورخہ جمعہ ۱۳ صفر ۱۲۴۵ھ، سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا ارادہ روزِ شنبہ، چہاردہم صفر و پانزدہم اگست کو، یا زیادہ سے زیادہ اس سے ایک دو روز بعد، کلکتے سے روانہ ہو جانے کا تھا ("نامہ"، ص ۸۷)۔ اس خط میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اب بروزِ پنجشنبہ، یعنی ۱۹ صفر، مطابق ۲۰ اگست، کو روانگی ہو گی۔ چوں کہ اگلا خط اس کے بعد کا ہے اور وہ یکشنبے کا لکھا ہوا ہے، اس لیے اسے شنبہ چہاردہم صفر، مطابقِ پانزدہم اگست، کی تحریر ہونا چاہیے۔

(۷۴) یہ خط پچھلے خط: ۱۶/۲۵ سے مربوط ہے جس میں غالب نے یکشنبے کو تودیعی ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ مکتوب الیہ نے اسی مناسبت سے انھیں یکشنبے کو کھانے کی دعوت دی ہو گی، جس کا اس خط میں تذکرہ ہے۔ اس لیے یہ خط پچھلے خط کے ایک دن بعد، یعنی یکشنبہ، پانزدہم صفر، کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔ غالب نے روانگی سے پہلے چند دن ہو گلی میں نواب علی اکبر خاں کے ہاں گزارے تھے ("مت"، ص ۱۱۷)۔ اس خط میں:

رخصت خواہم شد و بہ دریا رفتہ بہ زورق خواہم نشست،

سے بظاہر ہوگلی ہی کے لیے روانگی کی طرف اشارہ ہے۔

(۷۵) اس خط کے زمانۂ تحریر کے سلسلے میں بجز اس کے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ قیامِ کلکتہ کے دوران لکھا گیا ہے۔

(۷۶) اس خط کے بارے میں بھی صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ کلکتے میں قیام کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ محض دستار کے حوالے کی بنیاد پر یہ کہنا مشکل ہے کہ خط: ۱۲۱ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

(۷۷) یہ خط بھی کلکتے کے زمانۂ قیام کی تحریر ہے، لیکن تاریخ وماہ وسنہ کے تعین کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اس زمانے میں برجو تالاب پر کسی خاص موقع کی مناسبت سے کوئی میلہ لگتا تھا تو تاریخ اور مہینے کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

(۷۸) یہ خط اس مجموعے اور "متفرقات" میں مشترک ہے۔ خط کا جو حصہ "ن" سے خارج کردیا گیا ہے، اس میں یہ اطلاع بھی شامل ہے کہ:

نامہ موسومۂ مرزا عباس خاں رسانیدہ شدہ۔ (ص ۱۰۳)

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک خط مورخۂ "ہشتمِ شوال، روزِ آدینہ" (۱۲۴۵ھ) میں بھی مرزا غلام عباس خاں کی "طلبی" اور "انکشافِ حقائق" کے بعد "پس از یک ہفتہ" ان کے "نامۂ نامی" کا جواب لکھنے کی بات آئی ہے ("ست"، ص ۴۸)، اس سے خیال ہوتا ہے کہ تپاں کے نام یہ خط بھی اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔

(۷۹) ۴ ستمبر کی ربیع الاول کے ساتھ مطابقت کلکتے کے سفر اور تپاں کی وفات کے درمیانی عرصے میں صرف تین ہجری سنین ۱۲۴۵ھ، ۱۲۴۶ھ اور ۱۲۴۷ھ میں ممکن ہے۔ ۱۲۴۵ھ میں یہ تاریخ ۵ ربیع الاول کے مطابق ہوگی۔ یہ اس لیے ناقابلِ قبول ہے کہ غالب اس زمانے میں مرشد آباد اور باندے کے درمیان سفر میں تھے اور یہ خط دہلی سے لکھا گیا ہے۔ باقی دو تاریخیں ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۶ھ اور ۲۶ ربیع الاول ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے

۲۶ ربیع الاول ۱۲۴۷ھ مطابق ۴ ستمبر ۱۸۳۱ء، اس لیے ممکن نہیں کہ مولوی سراج الدین احمد کے نام کے خطوط میں اس تاریخ کا ایک خط موجود ہے اور اس میں تپاں کی علالت کا مطلقاً کوئی تذکرہ نہیں ("پنج آہنگ"، خط نمبر: ۳۶)، جب کہ انھی کے نام کے اور خط سے، جس پر کوئی تاریخ درج نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو تپاں کی اس بیماری (دردِ پہلو) کی اطلاع سراج الدین احمد ہی نے دی تھی اور یہ خط ان کے نام کے اس خط کے ساتھ ہی بھیجا گیا تھا:

> از نگارشِ قدوم پدید آمد کہ... مرزا احمد بیگ خاں از دردِ پہلو زحمت کشیدہ و بہ حسنِ تدبیرِ جناب سید احمد علی خاں رُوے افاقت دیدہ... نامۂ موسومۂ شاں می رسد، باید رسانید۔

ان حالات میں صرف ایک تاریخ ۴ ستمبر ۱۸۳۰ء بچتی ہے۔ یہ دونوں خط ("پنج آہنگ"، خط نمبر: ۵۸ و "ماثر"، خط نمبر: ۲۲/۷) اسی دن لکھے گئے تھے۔

(۸۰) مکتوب الیہ کا نام خط کے متن میں موجود ہے، اس لیے اس کے انتساب پر سوالیہ نشان لگانا بے معنی ہے۔

(۸۱) یہ خط مکتوب نمبر: ۲۲/۷ کا جواب الجواب معلوم ہوتا ہے، اس لیے اندازہ یہ ہے کہ ربیع الثانی ۱۲۴۶ھ میں لکھا گیا ہوگا۔ مرزا افضل بیگ کی وفات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(۸۲) یہ خط "متفرقات" میں نسبتاً کافی طویل ہے۔ اس زائد حصے کے ایک اندراج کے مطابق یہ خط مرزا افضل بیگ کی وفات کے قریبی زمانے میں "چہار شنبۂ آخریِ صفر" کے تیسرے روز لکھا گیا ہے۔ چوں کہ افضل بیگ کی وفات صفر ۱۲۴۷ھ کا واقعہ ہے، اس لیے یہ خط جمعہ، ۲۵ صفر ۱۲۴۷ھ کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(۸۳) قاضی صاحب نے اس خط کو سوالیہ نشان کے ساتھ تپاں سے منسوب کیا ہے۔ تپاں عمر میں غالب سے کافی بڑے ہونے کے باوجود ان کے بے تکلف دوستوں میں شامل تھے، جب کہ اس خط کے افتتاحی کلمے "سپہر آستانا" سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی مخاطب کوئی مقتدر اور بااثر شخصیت ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ مکتوب نگار نے مکتوب الیہ سے خواجہ محمد مستقیم صاحب کو سلامِ نیاز پہنچانے کی درخواست کی ہے۔ چوں کہ خواجہ صاحب ہوگلی میں رہتے تھے، اس لیے مکتوب الیہ کو بھی لازماً ہوگلی ہی میں مقیم ہونا چاہیے۔ اس پس منظر میں ہمارے نزدیک اس خط کے مکتوب الیہ نواب علی اکبر خاں طباطبائی قرار پاتے ہیں جو امام باڑۂ ہوگلی کے متولی تھے اور جنھیں گورنر جنرل کے دربار میں غالب سے بلند تر درجہ حاصل تھا۔

(۸۴) اس خط میں تاریخ، مہینے اور سنہ کے تعین کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ صرف یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قیامِ کلکتہ کے زمانے کی تحریر ہے۔

(۸۵) ہمارے نزدیک اس خط کے مکتوب الیہ تپاں نہیں، سراج الدین احمد ہیں، کیوں کہ اس کے ایک اہم بیان:

> ہر گاہ باوجود ایں بُعدِ مسافت سوردِ ایں عتاب و خطابم، در حالتِ قرب چگونہ بہ صیانتِ نفسِ خود توانم پرداخت

کے مخاطب کسی صورت میں بھی تپاں نہیں ہو سکتے، جن سے غالب کے تعلقات ہمیشہ نہایت خوش گوار اور دوستانہ رہے۔ خط کے کچھ اور اندراجات بھی ہمارے اس موقف کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً:

> (الف) نخست بہ زبان یا اختاد کہ فلانے قتیل را ناسزا می گوید۔ حالے بر من شوریدو انجمن با من معارض گردید۔
>
> (ب) مرزا افضل بیگ اگر ازیں نسبت اضافی کہ بہ ظاہر دارند، قطعِ نظر فرمایند پس نظر بہ کریم النفسی و نیک نہادیِ شما و یگانگی و ہمزادیِ مرزا صاحب، عداوتِ شما را بہتر

از مودّتِ بزرگانِ ایں دیار می دانم۔

(ج) اگر ہم خانگیِ من بہ خیالِ دوامِ صحبت است، آں خود صورت نخواہد بست۔ چہ پگاہ وقتِ رفتن بہ دفتر خانہ و بے گاہ، یعنی آخرِ روز باز آمدن بہ کاشانہ۔

پہلے بیان میں جس ہنگامہ آرائی کی طرف اشارہ ہے، اس کے بانی مبانی مرزا افضل بیگ تھے۔ مولوی محمد علی خاں کے نام کے ایک خط میں غالب کا بیان ہے:

افضلِ مذکور۔۔۔ در شعرا آوازہ درافگند کہ ایں اسد اللہ، غالب تخلص، قتیل را ناسزای گوید۔ ("نامہ"، ص ۴۰)

اس ہنگامہ آرائی کی سرپرستی مولوی عبدالکریم میر منشیِ دفتر خانۂ فارسی کے ایک قریبی عزیز کر رہے تھے۔

یکے از اقربائے مولوی عبدالکریم خاصۃً از بہرِ تذلیل و تخریبِ من انجمنے بنا نہادہ و مشاعرہ قرار دادہ۔

(ایضاً ص ۴۰)

مولوی عبدالکریم کے یہ عزیز مولوی سراج الدین احمد تھے۔ مولوی محمد علی خاں ہی کے نام کے ایک اور خط میں غالب نے لکھا ہے کہ:

قدوۃ مولوی سراج الدین احمد برادر زادۂ عبدالکریم اند۔

(ایضاً ص ۸۸)

خط کے دوسرے اقتباس میں مرزا افضل بیگ اور مکتوب الیہ کے درمیان "یگانگی و ہمزادی" کا ذکر آیا ہے۔ غالب مولوی محمد علی خاں ہی کے نام کے اول الذکر خط میں یہ وضاحت بھی کر چکے ہیں کہ مرزا افضل بیگ مولوی عبدالکریم کے ہم خانہ تھے:

افضل بیگ۔۔۔ بہ صیغۂ وکالت از جنابِ اکبر شاہ (ثانی) دریں دیار رسیدہ۔۔۔ با منشی عبدالکریم ہم خانہ است۔

(ایضاً، ص ۳۸)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ اور مرزا افضل بیگ کے درمیان "یگانگی و ہمزادی" سے اسی ہم خانگی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ تیسرے اقتباس میں مکتوب الیہ کے صبح جلدی دفتر جانے اور شام کو دیر سے گھر واپس آنے کا ذکر ہے۔ یہ بات غالب کے متعدد بیانات سے واضح ہے کہ سراج الدین احمد بھی اپنے چچا مولوی عبدالکریم کی طرح "اعیان و اشخاص دفترخانۂ فارسی" میں شامل تھے (ایضاً، ص ۸۸)، اس لیے یہاں بھی انھی سے تخاطب ہے۔ ان تمام شواہد کی روشنی یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ خط مولوی سراج الدین احمد کے نام ہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط تیسرے مشاعرے (منعقدہ ۳ اگست ۱۸۲۸ء) کے بعد اگلے دو تین ماہ کے اندر لکھا گیا ہوگا۔

(۸۶) اس خط کے مکتوب الیہ حتمی طور پر خواجہ فیض الدین حیدر ہیں، اور یہ وہی خط ہے جس کے جہاں گیر نگر (ڈھاکا) بھیجے جانے کا ذکر تپاں کے نام کے خط نمبر: ۱۳۱/۳ میں آیا ہے۔ موخرالذکر خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے مکتوب الیہ کے خط کے جواب میں یہ خط باہم "توفیر محبت" کا تعلق نہ ہونے کے باوجود محض اس لیے لکھا تھا کہ خاموشی کو کہیں ان کی "بے دماغی" پر نہ محمول کیا جائے۔ زیر بحث خط سے یہ واضح ہے کہ مکتوب الیہ، جو اس کی تحریر کے وقت ڈھاکے میں تھے، کچھ ہی دنوں پہلے کلکتے سے واپس گئے تھے اور واپس جاتے وقت غالب سے تودیعی ملاقات نہ کر سکے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ خواجہ صاحب کے علاوہ ڈھاکے میں کوئی اور غالب کا شناسا نہ تھا۔ یہ تمام شواہد اس خط کے خواجہ صاحب کے نام ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

(۸۷) خط کے آخر میں سنہ کے التزام کے بغیر ۲ رمضان کی تاریخ موجود ہے۔ قرائن اس شاہد ہیں کہ ۰ صر ۱۲۴۴ سکتا

(۸۸) یہ وہی خط ہے جو خط نمبر:۱۰/۱۵ کے ساتھ تپاں کو بھیجا گیا تھا اور ان سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ اپنے کسی ملازم کے ذریعے اسے مکتوب الیہ تک پہنچا دیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب اس زمانے میں کلکتے میں موجود تھے۔ شعبان ۱۲۴۴ھ (فروری ۱۸۲۹ء) کے بعد یہ غالباً دوسرا موقع تھا جب کہ وہ غالب کی موجودگی میں کلکتے آئے تھے۔

(۸۹) "فراہم آوردنِ فرمایش" اور "اشتیاقِ دیوانِ فقیر" جیسے اشارے خط نمبر:۱۴/۲۹ کو خط:۱۲/۳۰ سے اور "اجزاے خطابیِ نواب سید عالم علی خاں" سے متعلق استفسار خط نمبر:۱۶/۳۲ سے، جس میں "سیدِ عالم و قبلۂ اہلِ عالم" اور خواجہ محمد حسن، دونوں کا ذکر موجود ہے، مربوط کرتا ہے۔ یہ تینوں خط ایک ایک دو دو دن کے فرق سے ایک ہی ہفتے میں لکھے گئے ہیں۔

(۹۰) یہ خط اگلے خط، نمبر:۱۶/۳۲، سے مربوط ہے جو ۱۰ رمضان ۱۲۴۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ موخرالذکر خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تحریر سے قبل خواجہ محمد حسن "تیرگیِ روزِ سیاہِ نامہ نگار" کا بچشم خود مشاہدہ کر چکے تھے اور زیرِ بحث خط کے پہلے ہی جملے میں نامہ نگار اور مکتوب الیہ کی ملاقات کا حوالہ موجود ہے:

مطلبے کہ زبانِ گوہر فشاں بہ گوشم رسیدہ است۔

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط ۱۰ رمضان ۱۲۴۸ھ ہی کو، یا اس سے ایک دو روز پہلے، لکھا گیا ہے۔

(۹۱) شیخ علی حزیں اصفہانی اشرف الدولہ حسن علی خاں بسیرِ فائز دہلوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

چوں شادیِ ہمشیر در پیش است ہمگی منتظرِ قدوم می باشند۔

(۹۲) کلکتے کا ایک علاقہ آج بھی "مہدی بگان" کے نام سے معروف ہے۔ یہ "مہدی بگان"، "مہدی باغ" کی بنگلا شکل معلوم ہوتی ہے۔

(۹۳) محمد علی خاں کے نام کے دو خطوں میں بھی غالب نے "پیچ و تاب" کی بجائے

"پیچتاب" ہی لکھا ہے:

درس پیچتاب بوقلمونیِ اندیشہ... از دست رفت۔

("نامہ"، ص ۶۰)

اور

حضرت قبلہ گاہی در پیچتابِ اجارہ فرو ماندہ بودندے۔

(ایضاً، ص ۷۲)

(۹۴) یہ حافظ کے ایک مطلع کا مصرعِ ثانی ہے جو متن کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ پورا شعر یہ ہے:

اگر بہ مذہبِ تو خونِ عاشق است مباح

صلاحِ ما ہمہ آنست کاں تراست صلاح

(۹۵) اگلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ ابوالقاسم خاں صاحب اس بات سے واقف ہیں کہ بالارادہ آپ کو اطلاع دیے بغیر محفل سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔

(۹۶) غالب کا عربی زبان و قواعد کا علم بہت محدود تھا، چناں چہ انھیں "معترِض" (بہ کسرۂ "را") کے مقابلے میں اسمِ مفعول کے طور پر "معترَض" (بہ فتحۂ "را") کے استعمال میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ قیامِ کلکتہ کے زمانے ہی کی ایک اور تحریر میں بھی انھوں نے دونوں لفظ بالکل اسی انداز میں ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال کیے ہیں:

آوخ، غالبِ ہیچ و پارسی دانِ مسلّے درمیاں نیست تا عیار

معترِض فرا گرفتے و بہ دردِ دلِ معترَض وارسیدے۔

("نامہ"، ص ۱۰۷)

قاضی صاحب نے جو اصلاح تجویز فرمائی ہے، وہ بھی دخلِ کاتب سے بری نہیں معلوم ہوتی۔ "اعتراض" کا صلہ ہمیشہ "علیٰ" آتا ہے اس لیے "معترَض الیہ" کی بجائے "معترَض علیہ" ہونا چاہیے۔

(۹۷) غالب جب کلکتے پہنچے ہیں تو ان کے ساتھ ایک سائیس اور ایک کہار کو شامل

کر کے کل چھ ملازم تھے۔ اواخرِ صفر، یا اوائلِ ربیع الاول، ۱۲۴۴ھ (ستمبر ۱۸۲۸ء) میں انھوں نے بر بنائے ضرورت گھوڑا فروخت کر دیا تھا اور سائیس اور ایک خدمت گار کو جواب دے چکے تھے ("نامہ"، ص ۴۵)۔ ممکن ہے کہ بعد میں مزید ایک خدمت گار کو رخصت کر دیا ہو، یا کودک "مہار" بھی باقی ماندہ چار ملازمین میں شامل ہو۔

(۹۸) صحیح لفظ "تصدیع" ہے جس پر زیادتِ "ہا"، بقولِ صاحبِ "بہارِ عجم"، غلط ہے لیکن، صاحبِ "غیاث اللغات" کے مطابق، یہ ہائے زائد دراصل تائے وحدت ہے جو عام قاعدے کے مطابق "ہ" سے بدل گئی ہے۔ اس اعتبار سے "تصدیعہ" بمعنی "یک بار دردِ سر دادن" و "یک بار تکلیف دادن" درست ہے۔

(۹۹) "کلیاتِ نظمِ غالب" مخزونۂ خدا بخش لائبریری میں، جو غالب کے دوست رائے چھج مل کا لکھا ہوا ہے، ایک قطعۂ تاریخ کے عنوان میں بھی یہ لفظ اسی طرح لکھا گیا ہے:

جنبشِ قلم بہ نگارشِ تاریخِ امام باڑہ کہ در کلکتہ بہ محلۂ اتالی ... واقعست۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اسے اسی طرح لکھتے تھے۔

(۱۰۰) ۱۲۴۴ھ زیادہ صحیح ہے۔ گو اس تبدیلی سے نفسِ مطلب پر کوئی خاص اثر مرتب نہ ہوگا۔

(۱۰۱) اس موضوع پر قاضی صاحب کے مقالات "جہانِ غالب" اور "کچھ غالب کے بارے میں" (حصۂ دوم) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ قاضی صاحب کے علاوہ جن حضرات نے اس بحث میں شریک ہو کر دادِ تحقیق دی ہے، ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ("مقالاتِ صدیقی"، مطبوعۂ ۱۹۸۳ء)، ڈاکٹر شوکت سبزواری ("غالب فکر و فن" مطبوعۂ ۱۹۶۱ء)، سید قدرت نقوی (سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، غالب نمبر ۱۹۶۹ء)، اور ڈاکٹر نذیر احمد ("نقدِ قاطعِ برہان"،

مطبوعہ ۱۹۸۵ء) شامل ہیں۔ سبزواری صاحب اور قدرت نقوی صاحب کے مقالات غالب کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔

(۱۰۲) عام طور پر املا کی غلطی کو لکھنے والے کے جہل پر محمول کیا جاتا ہے۔ غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی لفظ، یا بعض الفاظ، دیدہ و دانستہ بلکہ بالقصد مروجہ املا کے خلاف لکھے جائیں تو اسے املا کی غلطی سے تعبیر کرنا درست نہیں۔

(۱۰۳) جہاں تک اردو کا تعلق ہے، غالب کا استعمال سند کا درجہ رکھتا ہے، اس پر ان کی گرفت نہیں کی جا سکتی۔ غالب سے پہلے سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں بھی اس لفظ کے استعمال کی مثالیں موجود ہیں:

منشیِ نُہ فلک مری تحریر دیکھ کر
سمجھے بغیر گر غلطی کا کرے گماں

(سودا)

بہ کمالِ فضل و دانش یہ بعید ہے کہ انشا
غلطی پہ تو مُصر ہو بہ مثالِ خودپسنداں

(انشا)

اس سے بھی میں گزرا، غلطی اور یہ سنیے
باندھے ہے کوئی خوشۂ انگور کی گردن

(۱۰۴) اگر "ن" میں یہ املا ہے تو یہ ناقل کا تصرف ہوگا۔ غالب، "رزیدنٹ" لکھتے تھے۔

(۱۰۵) "جامِ جہاں نُما" کا اجرا ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو ہوا تھا۔ یہ ہفتے میں ایک بار، ہر چہارشنبے کو، شائع ہوا کرتا تھا۔ ہری ہردت اس کے مالک اور منشی سدا سکھ لال اس کے ایڈیٹر تھے۔ شروع میں یہ اردو میں نکلا لیکن صرف دو مہینے کے بعد اس کی زبان بدل کر فارسی کر دی گئی۔ ایک سال کے بعد فارسی اخبار کے ساتھ ایک اردو ضمیمہ بھی نکلنے لگا جو پانچ سال تک جاری رہ کر بند ہوگیا۔

"جامِ جہاں نُما" نے بڑی لمبی عمر پائی۔ ۱۸۸۸ء تک اس کی اشاعت جاری رہنے کے شواہد موجود ہیں۔

(۱۰۶) "ھا" = ہندوستانی۔ رسالے کے سرورق پر اور دوسرے مواقع پر بھی اس کا نام بغیر "واو" کے لکھا جاتا تھا۔ یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا جو جنوری ۱۹۳۱ء میں نکلنا شروع ہوا اور اکتوبر ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔

(۱۰۷) صدیقی صاحب مرحوم کا ایک سلسلے وار مضمون "ہندُستان کے پرانے اخبار" کے زیرِ عنوان اکتوبر ۱۹۴۴ء سے اکتوبر ۱۹۴۵ء تک پانچ شماروں میں شائع ہوا ہے۔ یہ مقالہ اسی سلسلے کا ایک حصّہ ہے۔ "جامِ جہاں نما" کے بارے میں اس مقالے کے علاوہ محمد عتیق صدیقی ("آج کل"، فروری ۱۹۵۶ء) اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ ("آج کل"، جون ۱۹۶۳ء) کے مضامین بھی اہم ہیں، لیکن اس اخبار سے متعلق سب سے وقیع کام جناب گربچن چندن کی مبسوط تصنیف "جامِ جہاں نما" ہے جسے دسمبر ۱۹۹۲ء میں "مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی" نے شائع کیا ہے۔

(۱۰۸) جیسا کہ خط نمبر: ۹/۲۰ کے حاشیے سے متعلق ذیلی حاشیے میں بتایا جاچکا ہے، غالب اس لفظ کا املا "ررزیڈنٹ" (ررزی ڈن ٹ) لکھتے تھے۔ (عکسِ تحریر مشمولۂ "نامہ"، مقابل ص ۱۱۶)

(۱۰۹) "گلِ رعنا" کے نسخۂ لاہور، مملوکۂ خواجہ محمد حسن، میں دیباچے کے آخر میں ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ کی تاریخ درج ہے۔ دیباچہ بالیقین ترتیبِ کلام کے بعد لکھا گیا ہوگا۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلام کے انتخاب اور تسوید کا کام صفر ۱۲۴۴ھ میں مکمل ہوگیا ہوگا۔

(۱۱۰) دونوں خطوں میں دو مختلف اوقات میں قیام ہوگلی کا ذکر ہے۔

(۱۱۱) قیامِ کلکتہ کے دوران غالب اور ان کے احباب کے حلقۂ تعارف میں حکیم سیّد احمد علی خاں کے علاوہ صرف ایک اور حکیم ظفر علی خاں کا ذکر ملتا ہے جو "اشرافِ فیض آباد" میں سے تھے، لیکن وہ یکم ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ مطابق

۴ جون ۱۸۲۹ء، سے کچھ پہلے "عہدۂ سفارت" پر مامور ہو کر لکھنؤ سے کلکتے پہنچے تھے ("نامہ"، ص۹ پر)۔ چوں کہ یہ خط اس سے پہلے (رمضان ۱۲۴۴ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے بظاہر یہاں حکیم احمد علی خاں ہی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

(۱۱۲) لفظ "استشعار" اسی معنی میں غالب کی اس زمانے کی ایک اور تحریر میں بھی موجود ہے، اس لیے اس غلطی کو کاتب سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

(چوں) از رسیدنِ جوابِ گرامی نامہ استشعارے رفت، معلوم شد کہ مخدومِ ممدوح نیز ہمچو من چشمے بہ راہ بردارند۔
("نامہ"، ص ۳۳و۳۴)

(۱۱۳) یہ کاتب کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔

(۱۱۴) مولوی محمد علی خاں کے نامِ ایک خط میں غالب نے روزانہ اخراجات کے سلسلے میں اپنے ملازمین کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

من نیز اگر غلط نہ کنم، بجاے خود نیمہ آدم بہ شمار توانم آمد، چہ بنیِ نوعِ من اکثر مرتبہ در شبانروز دو بار تنورِ معدہ می تابند (و من یک بار)۔۔ ("نامہ"، ص۴۵)

اس بیان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب معمولاً دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے۔

(۱۱۵) اس سے پہلے خط میں پنجشنبے کے دن روانگی کا ذکر ہے۔ یہاں دوشنبے کے دن روانگی کے قصد سے بظاہر ہوگلی کی طرف روانگی مراد ہے۔

(۱۱۶) یہ خط "متفرقات" میں بھی موجود ہے۔ وہاں "فرزندانِ ارجمنداں" کی بجاے "فرزندانِ ارجمند" ہے (ص ۱۰۳)۔

(۱۱۷) "مآثرِ غالب" کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب کو اس لفظ کے استعمال کی ایک مثال مل گئی تھی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام ایک خط میں لکھتے

ہیں:

ماثرِ غالب کے حواشی میں میں نے غالب کے مستعمل لفظ "چندم" کی نسبت لکھا ہے کہ غالب کی تحریر کے علاوہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ ابھی حال میں عبید زاکانی کی نثر میں اس کی سند ملی ہے۔

(بحوالہ "غالب نامہ" نئی دہلی، شمارہ: جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۴)

(۱۱۸) "متفرقات" میں "عریضہ" نہیں، "عرضہ" ہے۔

(۱۱۹) قاضی صاحب کے درج کردہ اختلافاتِ متن نہ تو پوری طرح مطابقِ اصل ہیں اور نہ کلی طور پر جامع و مانع۔ ہم نے اس مجموعے اور "متفرقات" میں مشترک تمام خطوط کے اختلافات اپنے حواشی میں ظاہر کر دیے ہیں۔ متذکرہ فرق کا اندازہ کرنے کے لیے ان حواشی کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

(۱۲۰) مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالب نے اپنا پورا پتا اس طرح لکھا ہے:

شہر کلکتہ، قریب چیت بازار، در شملہ بازار، نزدیک تالاب ... بہ مطالعہ اسد برسد۔ ("نامہ"، ص ۳۹)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

نشانِ شملہ بازار، گول تالاب و حویلیِ میر احمد کافی است۔

(ص ۵۵)

(۱۲۱) یہ عرفی سے منسوب ایک مقطع کا مصرعِ ثانی ہے، لیکن یہ مقطع، یا اس زمین میں کوئی غزل، عرفی کے متداول دیوان میں موجود نہیں۔ پورا شعر یہ ہے:

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

(۱۲۲) جس وقت یہ خط لکھا گیا ہے، مکتوب الیہ ڈھاکا پہنچ چکے تھے۔

(۱۲۳) مولوی احمد علی کے بیان سے ظاہر ہے کہ غالب نے "بدیہیات" لکھا تھا، اس لیے اس غلطی کو سہوِ ناقل قرار دے کر نظرانداز کر دینا چاہیے۔ "گنجائی" سے قبل اس لفظ کے دوبارہ استعمال کی بھی یہی صورت ہے۔ "اجلہ" کے معاملے میں احمد علی کا اعتراض درست ہے۔ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ڈاکٹر زبیر صدیقی نے "اجل" کو صحیح قرار دیا ہوگا۔ یہاں قاضی صاحب سے یقیناً سہو ہوا ہے۔ "اجل" "جلیل" کا اسم تفضیل ہے اور "اجلیٰ" "جلی" کا، اور یہاں محل "جلی" ضدِ "خفی" کا ہے نہ کہ "جلیل" کا، اس لیے "اجلاے بدیہیات" ہی درست ہے۔

(۱۲۴) "طا" = ۱۲ (۱۲/۳۰)

(۱۲۵) ممکن ہے کہ اصل میں "رفتن... بہ گرگانوا" یا "رفتن... براے گرگانوا" ہو اور ناقل کی غلطی سے "رفتن... براہ گرگانوا" بن گیا ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو مطلب واضح ہے، یعنی دیوان حاصل کرنے کی غرض سے ارادۂ سفر ملتوی کر دیا۔

(۱۲۶) یقیناً دیوانِ اردو کا ذکر ہے جو رجب ۱۲۳۱ھ مطابق جون ۱۸۱۶ء میں مرتب ہو چکا تھا۔ دیوانِ فارسی اس خط کی تحریر سے تقریباً دو برس بعد ۱۲۵۰ھ/۳۵-۱۸۳۴ء میں مرتب ہوا۔ متداول دیوانِ اردو کے دیباچے میں، جو ایک روایت کے مطابق "بست و چہارم ذیقعدہ سنہ ہجری ۱۲۴۸" کی تحریر ہے، خود غالب کی یہ وضاحت موجود ہے کہ:

نگارندۂ ایں نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخابِ دیوانِ ریختہ بہ گرد آوردنِ سرمایۂ دیوانِ فارسی برخیزد۔

یعنی جس وقت یہ خط لکھا گیا ہے، دیوانِ فارسی کی ترتیب کا کام شروع بھی نہیں ہوا تھا۔

(۱۲۷) "طا" = لکھنؤ۔

(۱۲۸) یہ خط جس زمانے میں لکھا گیا ہے، نواب منیر الملک وزیرِ اعظم حیدر آباد کا

استقال ہو چکا تھا اور نئے وزیر اعظم کے تقرر کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ ظاہر ہے کہ عالم علی خاں بھی ان کی جانشینی کے امیدوار ہوں گے۔ "استقبالِ دولت ہائے مستقبلہ" سے غالباً اسی کوشش میں ان کی متوقع کام یابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار مقصود ہے۔

(۱۲۹) یہ خط بہ گمانِ غالب میر عالم علی خاں کے نام ہے، جن کے "اجزاے خطابی" رقعہ نمبر ۲۹/۱۴ میں معلوم کیے گئے ہیں اور جن کی سرکار سے بہ ظاہر خواجہ محمد فخر اللہ وابستہ تھے۔ خط کے شروع میں ان کا نام اور القاب درج نہیں، لیکن پس نوشت کے طور پر اس اندراج سے کہ:

در افزائشِ القاب برادر صاحب خود اختیار دارند۔ اگر یک دو لفظ بیفزایند، زیاں ندارد،

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خط کے ساتھ مکتوب الیہ کا نام اور القاب موجود تھے۔ ممکن ہے کہ یہ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ دو تین طرح کسی علاحدہ کاغذ پر لکھے گئے ہوں۔ "برادر صاحب" سے بہ ظاہر خواجہ محمد فخر اللہ کی جانب اشارہ ہے جن کی طرف سے یہ خط لکھا گیا ہے۔

(۱۳۰) غالب کے دل میں حیدر آباد سے توسّل پیدا کرنے کی خواہش شروع ہی سے موجود تھی۔ مولوی محمد علی خاں کو ۱۳ جون ۱۸۲۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

باللہ اگر آغازِ مقدمہ مبشر و مشعرِ حسنِ خاتمہ نبودے، امروز جاے من بہ حیدر آباد بودے، یا بہ دیارے از دیار ہاے عجم۔ ("نامہ"، ص ۴۱)

بعد کے زمانے کے بعض ارکینِ دولت و عمائدینِ سلطنت کی شان میں ان کے قصائد بھی موجود ہیں۔

(۱۳۱) ایک امیر کی مدح کے قصیدے، یا نثر، کو بلا ترمیم و تغیر کسی دوسرے امیر کی خدمت میں پیش کر دینا بہ ظاہر بعید از قیاس ہے۔ اگر غالب نے

اس موقع کے لیے کوئی نئی نثر نہ لکھی ہوگی تو مستذکرہ نثر میں بڑے پیمانے پر ردو بدل ضرور کیا ہوگا۔

(۱۳۲) یہ ترکیب، جو یقیناً درست نہیں، غالب نے مولوی محمد علی خاں کے نام کے ایک خط میں بھی استعمال کی ہے:

> نامۂ موسومہ ... مولوی ولایت حسین بہ خدمت رفعات درجتِ مکتوب الیہ... رسانیدہ شد۔ ("نامہ"، ص ۸۱)

فہرستِ ماخذ

کتب

(۱) "آثار الصنادید" از سرسید احمد خاں، شائع کردہ سنٹرل بک ڈپو، اردو بازار دہلی، ۱۹۶۵ء

(۲) "احوالِ غالب"، مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد، شائع کردہ انجمنِ ترقیِ اردو (ہند)، دہلی، طبع ثانی: ۱۹۸۶ء

(۳) "اردو صحافت کی تاریخ" از ڈاکٹر نادر علی خاں، شائع کردہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء

(۴) "اردوے معلیٰ" از مرزا غالب، مطبوعہ مطبعِ اکمل المطابع، دہلی، طبعِ اول: ۱۸۶۹ء

(۵) "باغِ دو در"، مرتبہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، شائع کردہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۶۸ء

(۶) "بزمِ غالب" از عبد الرؤف عروج، شائع کردہ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۶۹ء

(۷) "پنج آہنگ" از مرزا غالب، مطبوعہ مطبع دار السلام، دہلی، ۱۸۵۳ء

(۸) "پنج آہنگ" از مرزا غالب، (عکسی ایڈیشن)، مرتبہ حنیف نقوی، شائع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء

(۹) "تجلیات" از مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ

(۱۰) "تحفۃ العراقین" از خاقانی شروانی، مطبوعہ مطبعِ نول کشور، کان پور، ۱۸۶۷ء

(۱۱) "تحقیقی مضامین" از مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

(۱۲) "تذکرۂ ماہ و سال" از مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

(۱۳) "تذکرۂ مشاہیرِ کاکوری" از حافظ محمد علی حیدر، مطبوعہ مطبعِ اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء

(۱۴) "تقویمِ غالب" از حنیف نقوی (غیر مطبوعہ)

(۱۵) "تقویمِ ہجری و عیسوی" از ابوالنصر محمد خالدی، شائع کردہ انجمنِ ترقیِ اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۳۹ء

(۱۶) "تلامذۂ غالب" از مالک رام، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، طبعِ ثانی: ۱۹۸۴ء

(۱۷) "تواریخِ ڈھاکہ" از رحمان علی طیش، مطبوعہ اسٹار پریس آف انڈیا، آرہ، ۱۹۱۰ء

(۱۸) "جامِ جہاں نما" از گربچن چندن، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

(۱۹) "جہانِ غالب" از قاضی عبدالودود، شائع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

(۲۰) "حیاتِ اجمل" از قاضی عبدالغفار، شائع کردہ انجمنِ ترقیِ اردو (ہند)، علی گڑھ ۱۹۵۰ء

(۲۱) "خود نوشت سوانحِ حیاتِ نساخ" از عبدالغفور نساخ، مرتبہ ڈاکٹر عبدالسبحان، شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۹۸۶ء

(۲۲) "دستورالفصاحت"، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، مطبوعہ ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۳ء

(۲۳) "دیوانِ غالب"، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، شائع کردہ انجمنِ ترقیِ اردو (ہند) دہلی، طبعِ ثانی: ۱۹۸۲ء

(۲۴) "ذکرِ غالب" از مالک رام، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۴ء

(۲۵) "سخنورانِ گجرات" از سید ظہیرالدین مدنی، شائع کردہ ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء

(۲۶) "سیرِ سیاح" مرتبہ منشی انوار حسین تسلیم و احمد حسن خاں جوش، مطبوعہ مطبعِ اودھ اخبار، لکھنؤ، ۱۸۷۲ء

(۲۷) "غالب - احوال و آثار" از حنیف نقوی، شائع کردہ ادارہ نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۹۰ء

(۲۸) "غالب اور صفیر بلگرامی" از مشفق خواجہ، شائع کردہ ادارہ عصری مطبوعات، کراچی، ۱۹۸۱ء

(۲۹) "غالب - فکروفن" از شوکت سبزواری، شائع کردہ انجمنِ ترقیِ اردو (پاکستان)، کراچی، ۱۹۶۱ء

(۳۰) "فسانۂ غالب" از مالک رام، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

(۳۱) "قاطعِ برہان ورسائلِ متعلقہ"، مرتبہ قاضی عبدالودود، شائع کردہ ادارہ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ، ۱۹۶۷ء

(۳۲) "کافل الاسعاد شرحِ قصیدۂ بانت سعاد" از نجف علی خاں، مطبوعہ مطبعِ حسینیہ، بنارس، سنہ ندارد۔

(۳۳) "کچھ غالب کے بارے میں" از قاضی عبدالودود، شائع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

(۳۴) "گلشنِ بے خار" از نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مطبوعہ مطبعِ لیتھو گرافک، دہلی اخبار، دہلی، ۱۸۳۷ء

(۳۵) "متفرقاتِ غالب"، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، شائع کردہ کتاب نگر، لکھنؤ، طبعِ ثانی: ۱۹۶۹ء

(۳۶) "مقالاتِ صدیقی" (پہلا حصہ) از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، شائع کردہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء

(۳۷) "مکاتیبِ غالب" مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، مطبوعہ مطبعِ سرکاری، ریاست رام پور، طبعِ ثانی: ۱۹۴۳ء

(۳۸) "نامہ ہائے فارسیِ غالب"، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، شائع کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء

(۳۹) "نقدِ قاطعِ برہان" از پروفیسر نذیر احمد، شائع کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

(۴۰) "نگارستانِ سخن" از نواب سید نورالحسن خاں، مطبوعہ مطبعِ شاہ جہانی، بھوپال، ۱۸۷۶ء

(۴۱) "ہفت آسمان" از مولوی احمد علی، مرتبہ ہنری بلاخمین، مطبوعہ بپٹسٹ مشن پریس، کلکتہ، ۱۸۷۳ء

(۴۲) "یادِ رفتگاں" از سید سلیمان ندوی، مطبوعہ مطبعِ "معارف"، اعظم گڑھ، طبعِ ثانی: ۱۹۷۶ء

(۴۳) "یادگارِ غالب" از مولانا حالی، شائع کردہ اُتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

رسائل و جرائد

(۱) "آج کل" (ماہ نامہ)، دہلی، شمارہ ہائے فروری ۱۹۵۳ء و فروری ۱۹۶۰ء

(۲) "اردوئے معلیٰ"، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی، غالب نمبر، حصہ: ۳

(۳) "خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری جرنل"، پٹنہ، شمارہ ہا: ۷۵ تا ۷۷، ۱۹۹۳ء

(۴) "روحِ ادب" (سہ ماہی)، مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ، شمارہ: جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء

(۵) "شاعر" (ماہ نامہ) بمبئی، جلد نمبر: ۵۲، شمارہ نمبر: ۵ و ۶ بابت ۱۹۸۱ء

(۶) "غالب نامہ" (ششماہی)، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، شمارہ ہا: جولائی، اکتوبر ۱۹۷۶ء، جنوری ۱۹۸۳ء، جنوری ۱۹۸۶ء و جنوری ۱۹۹۷ء

(۷) "ماہِ نو" (ماہ نامہ)، کراچی، غالب نمبر، جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

(۸) "کتاب نما" (ماہ نامہ)، نئی دہلی، شمارہ: فروری ۱۹۹۶ء

(۹) "نقوش"، لاہور، خطوط نمبر، حصہ سوم۔

۶۴۴۱

فارسی خطوطِ غالب

ترجمہ و فرہنگ و حواشی

از

پرتو روہیلہ

بنام مرزا احمد بیگ تپاں(۱)

(۱)

صاحبِ عظمت و فیض پناہ جناب مرزا احمد بیگ خاں صاحب!

اللہ آپ کے سایۂ عالی کو دوام بخشے۔ عرض یہ ہے کہ فدوی کا ایک رقعہ مولوی سراج الدین احمد صاحب کے نام جنابِ عالی کے لیے اس عریضۂ نیاز میں ملفوف پہنچ رہا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اپنی طرف سے شادی کا دعوت نامہ مرزا اکبر بیگ کے نام لکھ کر مولوی سراج الدین احمد کے رقعے کے ہم راہ میرے آدمی کے سپرد کر دیں گے اور کہیں گے کہ جا کر مہدی باغ پہنچا دے۔ وہ کہار، جو اس عبودیت نامے کو لے کر آرہا ہے، عقل سے بے بہرہ ہے، (چناں چہ) سوچا کہ اس فکر و پریشانی کے باوجود خاطر خواہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ مجبوراً مولوی سراج الدین احمد کے نام خط لکھ کر آپ کے لفافے میں رکھا اور اس کی تفصیل آپ کو لکھ دی اور کہار کو آپ کے حکم کی تعمیل کی ہدایت کر دی۔ فقط۔ مولوی صاحب کے نام رقعہ اس لیے لکھنا پڑا کہ کہار کو مرزا اکبر بیگ کا گھر معلوم نہیں۔

(۴ اور ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ اور ۲۳ فروری ۱۸۲۹ء کے درمیان لکھا گیا۔)

(۲)

بندہ نواز! آپ کا گرامی نامہ پہنچا اور منکشفِ احوال ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ رسم برسرِ محفل ادا کروں، کیوں کہ میں نے اپنے شہر میں یہ نہیں دیکھا کہ بسم اللہ کی خوشی کی

مجلسوں اور محفلوں میں کوئی چیز بچے کو دیتے ہوں، البتہ ختنے کی تقریب میں ایسا ہوتا ہے، لیکن بسم اللہ کی تقریب میں دو رسمیں میں نے اپنے شہر میں دیکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچے کے چچا اور بھائی اس مولوی کو، جو "سورۂ اقراء" پڑھاتا ہے، کچھ دے دلا دیتے ہیں اور بس۔ دوسرے یہ کہ میوے کے خوان اور زرِ نقد بطور مبارک بادی کے بھیجتے ہیں، فقط۔ چناں چہ مولوی کو کچھ نذر کرنے کی جب رسم ہی اس علاقے میں نہیں ہے تو اس کو یہاں کیوں کیا جائے۔ ہاں البتہ میوہ اور مصری بھیجنا کہ برادری کی رسم ہے (درست ہے)۔ میں چوں کہ مسافر ہوں اور مالی وسائل نہیں رکھتا، بہرطور، جس قدر بھی میرے دل میں آیا، نقدی کی شکل میں بھیج دوں گا اور اس ضمن میں آپ کی کسی قسم کی معذرت نہ سنوں گا۔ اور بس۔

متعلقہ حضرات کی خواہش بھی اگر معلوم ہو جاتی تو برا نہ تھا۔ میں نے یہ بات مصلحتاً لکھی ہے۔ اس پر کسی اصرار یا ایذا کی نیت نہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو وہ خط، جو خان صاحب مخدوم کے توسط سے صبح جناب کی خدمت میں پہنچا ہے، اپنے کسی آدمی کے ہاتھ مولوی صاحب مخدوم سراج الدین احمد صاحب کو بھیج دیں اور ایک رقعہ اپنی طرف سے بھی لکھ دیں کہ اسد اللہ خاں غالب نے مجھے اس طرح تحریر کیا ہے۔ اب آپ کی کیا صلاح ہے؟ دیکھیں، مولوی صاحب مخدوم کیا فرماتے ہیں، اور اس حد تک بھی آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر آپ چاہیں تو درست ہے، ورنہ ہم سب کی بھی وہی صلاح ہے جو آپ کی ہے۔

زیادہ نیاز، اسد اللہ اسد۔

(۴ اور ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ اور ۲۳ فروری ۱۸۲۸ء، کے درمیان لکھا گیا۔)

(۳)

مہربانی کرنے والے میرے مخدوم اور میرے مطاع جناب مرزا احمد بیگ خاں صاحب، خدا ان کی عظمت کو دوام بخشے۔ میرے مخدوم، نورچشمی محمد علی خان کی تقریب بسم اللہ (۲) کی رات یہ اتفاق ہوا کہ جب آدھی رات گزر گئی، میں اپنے گھر واپس آگیا، لیکن

چوں کہ میں اپنے آپ کو "مہمان" تصور نہ کرتا تھا، اور ہمارے درمیان کوئی تکلف بھی نہیں تھا، اس لیے رخصت کا رسمی تکلف ایک طرف رکھ کر (بغیر آپ کو) اطلاع دیے(۳) چل دیا۔ مخدومی جناب ابوالقاسم خان صاحب اس امر سے باخبر ہیں۔ غرض رات کے (باقی) دو پہر اونگھتے گزارے۔ صبح سویرے اٹھ کر ہوگلی روانہ ہو گیا اور دو روز وہاں آرام کرکے کل پیر کو دن ڈھلے گھر واپس آیا۔ مخدومی نواب علی اکبر خان نے سلام کہا ہے اور مبارک باد دی ہے۔ یہ میری ہرزہ گردی شوق کی خبریں تھیں جو بیان کی گئیں۔ امید رکھتا ہوں، اپنی اور صاحب زادگان کی خیر خیریت سے مطلع فرمائیں گے۔

زیادہ نیاز، اسداللہ اسد۔

(بروزِ منگل، ۱۱ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۶ فروری ۱۸۲۹ء، لکھا گیا۔)

(۴)

نوازش نامہ پہنچا اور اس نے میری عاجزی کی آبرو بڑھا دی۔ تینوں قطعوں کو میں نے اپنے دعوے کے جسم کی روح سمجھتے ہوئے محفوظ کر لیا ہے۔ خیال ہے کہ چند روز شہر کر محفلِ مشاعرہ میں بلند آواز سے پڑھے جائیں تاکہ اہلِ محفل بھی سن لیں اور اعتراض کرنے والے کی رسوائی اور معترض (۳) کی گراں رنجگی ان پر ظاہر ہو جائے۔ رہا جناب کی عنایات کا شکر اور جنابِ عالی ابوالقاسم خان صاحب کی غم خواریوں کا اظہارِ سپاس، تو کیا عرض کروں کہ حوصلۂ زبان و بیان سے باہر ہے۔ مجبوراً اس کو دل و جان کے حوالے کر دیا ہے۔ آداب و تسلیمات و اظہارِ تشکر اس بندۂ عجز شناس کی جانب سے پیش کریں۔ فقط۔

(اتوار، ۶ جولائی ۱۸۲۸ء، مطابق ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ اور اتوار، ۳ اگست ۱۸۲۸ء، مطابق ۲۱ محرم ۱۲۴۴ھ کے درمیان لکھا گیا۔)

(۵)

قبلۂ من! نہ معلوم یہ میری سادہ لوحی ہے یا حقیقت بھی یہی ہے کہ میں جناب عالی کے ملازموں اور خدمت گاروں کو اپنا ملازم اور خدمت گار سمجھتا ہوں۔ تین روز ہوئے ہیں کہ میرا آدمی برابر جاتا ہے اور جانو کو تاکید کر کے آتا ہے اور ہر روز میں شام تک اس کا انتظار کرتا ہوں۔ (حقے کے) نیچے ٹوٹ چکے ہیں۔ میرے پاس آدمی کہاں کہ یہ کام کرا سکے۔ ایک کہار اور دو خدمت گار میرے پاس ہیں، وہ بھی (ایسے کہ) شہر اور اہلِ شہر سے ناواقف۔ ستم ہے، اگر ایسی تنہائی اور بے کسی میں آپ بھی چارہ سازی و غم خواری نہ کریں۔ فرض کیا، جانو آپ کے سامنے یہ عذر پیش کرتا ہے کہ مجھے نیچہ بند طاہی نہیں (تو عرض یہ ہے کہ) مجھے نیچہ بند نہیں چاہیے۔ جانو سے ارشاد ہو کہ زحمت کر کے میرے پاس آ جائے تاکہ نیچے اس کے حوالے کر دوں اور جس طرح ان کی مرمت ہو سکتی ہے، اس کو سمجھاؤں تاکہ کام چل نکلے۔ آج اس وقت اثنائی کے لیے سوار ہو کر جا رہا ہوں۔ اگر خیریت رہی تو ابتدائے شب حاضرِ خدمت ہوں گا۔ بہرحال، کل صبح سویرے جانو میرے پاس آ جائے۔ زیادہ حدِ ادب۔ اسد اللہ خاں، فقط۔

(یکم اور نو صفر ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۳ اور ۲۱ اگست ۱۸۲۸ء کے درمیان لکھا گیا۔)

(۶)

سرکار کے خادموں کی بے پروائی تحریر و تقریر میں نہیں سما سکتی۔ مجبوراً نیچہ بند کو جانو کے اور جانو کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اور بس۔

پہلے تو نورچشمی محمد علی کی، خدا اس کی عمر دراز کرے، خیریت کی اطلاع دیں کہ دل کو سکون ہو اور جان کو قرار آئے۔ اس کے بعد اس خط کو، کہ آپ کے نام ہے، اطمینان کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھیں اور جب "الف" سے "یے" تک آپ اس پر نظر ڈال لیں تو پھر اس کو اپنی بیاض میں نقل کر کے اصل خط پھاڑ دیں، پانی میں بہا دیں یا نذرِ آتش کر

دل۔ زیادہ نیاز۔ فقط۔

(صفر ۱۲۵۵ھ مطابق اگست ۱۸۲۸ء، میں لکھا گیا۔)

(۷)

جناب مرزا صاحب گرامی صفات و پسندیدہ عادات، مرکز لطف و کرم، خدا کرے کہ اس کی عنایات روز افزوں ہوں۔ نیاز و تسلیم کی رسم کے اظہار کے بعد یہ عرض ہے کہ وہ نثر، جو آپ نے بھیجی تھی، نظر سے گزری اور جب تک آنکھ اس تحریر کی سیاہی سے آشنا ہوئی ایک عجیب حیرت رُونما ہوئی کہ جس کی وضاحت ضروری ہے، لیکن چوں کہ کسی ہنگامہ آرائی کا خیال یا کسی انصاف طلب محاکمے کی ہماری نیت نہیں، اس لیے ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ عبارت کی آرائش سے اس صفحے (خط) میں اجتناب کریں گے اور اعتراضات کے جواب کی امید نہیں رکھیں گے تاکہ ہر وہ شخص، جو دیکھے، یہ جان لے کہ ہمیں جواب دینے کی خواہش یا مقابلے کی نیت نہیں۔ مختصر اور مفید مطلب یہ کہ ان اوراق میں یہ مصرع ہم نے دیکھا:

نگاہش از درازی ہائے مژگاں بر نمی آید

اور اسی طرح اس مصرع والا شعر:

کردم آں نالہ کہ تا شب اثرے باز نہ داد

بے معنی ہے۔ خاتمہ کلام۔

ہیہات! "از درازی ہائے مژگاں"، کیا معنی ہوئے؟ اور "کردم آں نالہ" سے کیا مراد ہے؟ کاغذ کے اس پلندے کی جو مشاعرے میں میری نظر سے گزرا ہے، اچھی طرح دیکھیں۔ اس میں مطلع اس طرح لکھا ہے:

نہ از ناز است کز چشم وے آساں بر نمی آید
نگاہش با درازی ہائے مژگاں بر نمی آید

لیکن شعر یہ ہے:

آہ ازاں نالہ کہ تا شب اثرے باز نہ داد

ہم آہنگیِ مرغانِ سحر خواں زدہ

مقصد یہ کہ شعر کو غلط جانیں، پر غلط پڑھیں نہیں۔ دوسرے اسی بیاض میں لکھا تھا کہ:

"گذاشتن و گذشتن" و "پذیرفتن" کو "زائے ہوز" سے لکھنا املا کی غلطی ہے۔

اے نکتہ رس! اس کو املا کی غلطی اس وقت کہہ سکتے ہیں جب لکھنے والا اس سے واقف نہ ہو اور اس سے تحریر میں یہ غلطی ہو جائے۔ حالاں کہ ہماری تحقیق ہمارے لیے کافی اور اپنی ذات ہی پر تمام ہو جاتی ہے۔ اگر قبول نہ ہو تو خوشی سے پھولیں گے نہیں اور اگر اس پر معترض ہوں گے تو دکھ سے زار نالی نہیں کریں گے۔ طرزِ تحریر کو املا کی غلطی کہنا غلط ہے۔ ہاں، اگر تحریر کی غلطی کہیں تو چنداں مضائقہ نہیں۔ غرض یہ کہ غلطیِ املا یہ ہے کہ مثلاً "ولد الحرام" کو کوئی شخص چھوٹی "ہ" سے لکھے اور ثالث کو دونوں جگہ "س" سے لکھے یا اسی طرح اعتراض کو "ز" کے ساتھ تحریر کرے اور ضبط کو "ت" کے ساتھ لکھے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

لہٰذا، اس عرض داشت کا مقصد کوئی شکایت نہیں، جس طرح وسطِ خط میں وضاحت کر چکا ہوں۔ یہ تحریر طولانی صرف اس امید پر ہے کہ جاننے والے جان لیں اور سمجھنے والے سمجھ لیں۔ اللہ بس، باقی ہوس۔ راقم ننگِ خلقت اسد اللہ، اور بس۔

(اگست ۱۸۲۸ء، مطابق صفر ۱۲۴۴ھ میں لکھا گیا۔)

(۸)

میری بے کسیوں کے سہارے! میرا دل محمد علی خاں اور اس کے بھائی کے احوال کا منتظر ہے۔ امید ہے کہ ان چوبیس گھنٹوں میں آپ کو کچھ فرصت ملے گی اور آپ عافیت کا مژدہ سنا کر میرے تن میں جان ڈال دیں گے اور اس الجھن اور پریشانی سے نجات بخشیں گے۔ فقط۔

(صفر ۱۲۴۴ھ، مطابق اگست ۱۸۲۸ء، میں لکھا گیا۔)

(۹)

میرے مخدوم و مطاع، خدا آپ کو سلامت رکھے! آج کمہار پانی لانے کے لیے لال ڈگی چلا گیا۔ چوں کہ صبح کا وقت ہے اور میرے دونوں آدمی دوسرے کام میں لگے ہیں۔ مجبوراً کوڈک کمہار کو عبودیت نامے کے ذریعے آستاں بوسی کے لیے بھیجا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر اپنے ملازموں میں سے کسی ملازم کو اخبار "جام جہاں نما" دے کر کوڈک کمہار کے ساتھ میرے پاس بھجوا دیں۔ میں ریزیڈنٹ دہلی کی بابت اوراق مذکورہ سے دریافت کر کے اسی صورت سے جناب کی خدمت میں واپس بھیج دوں گا اور اگر کوڈک کمہار کے ہاتھ بھی بھیج دیں تو بھی چنداں خطرے اور خوف کا باعث نہیں ہوگا۔

زیادہ نیاز فقط۔

امید کرتا ہوں کہ تحریر کی زحمت اٹھا کر اپنی خیریت کی خوش خبری تحریر فرمائیں گے کہ دلِ پُرشورش کو سکون ہو اور حرصِ پیشِ جاں کو آرام آ جائے۔ سلام پر بات کا اختتام خیر ہے۔

اسد اللہ فقط۔

(جنوری ۱۸۲۹ء، رجب ۱۲۴۴ھ میں لکھا گیا۔)

(٦١)

(۱۰)

گرامی قدر، "جامِ جہاں نما" کا پرچہ ملا۔ دراصل جناب ریزیڈنٹ دہلی کے ورود کی بابت معلوم کرنا مقصود تھا۔ معلوم ہوا ابھی تک الور ہی میں ہیں۔ (اور) اگر وہاں سے سیدھے جودھ پور چلے گئے تو ان کی واپسی مدت بعد ہوگی اور اگر وہیں سے واپس آ جاتے ہیں تو کام بھی جلد ہوتا نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ پرچہ دیکھا۔ اسی صورت جامع نوازش نامہ کے جواب کے دیا گیا۔ دوشالہ بھی اسی کے ہاتھ بھیج دیا گیا ہے، مل جائے گا۔ زیادہ نیاز۔

عجیب بات ہے کہ اچار سے "اگل رکھنا" کے بارے میں مجھے یاد دیا اور نہ آپ نے بھیجے۔ یہ بات خط لکھ چکنے کے بعد خیال میں آئی۔ اسد اللہ۔

(جنوری ۱۸۲۹ء، رجب ۱۲۴۴ھ میں لکھا گیا۔)

(۱۱)

میرے قدوم، میرے مطاع، میری جائے پناہ مرزا احمد بیگ صاحب، خدا آپ کے لطف کو دوام بخشے، آپ کی عین عنایت (میرے) شاملِ حال ہے۔ خدمتِ عالی میں یہ عرض ہے کہ آج مناسب وقت پر پہلے دفتر پہنچ کر وہاں سے لارڈ صاحب کی بارگاہ میں جا کر حضوریابی کا شرف حاصل کیا۔ روزِ گذشتہ کی طرح آج بھی مرزا افضل بیگ صاحب اور حضرت مولوی سراج الدین صاحب کی دل داری کے لیے اسی جگہ رات گزارنی پڑی۔ انشاء اللہ کل دوپہر تک واپس اپنے غم خانے میں پہنچ جاؤں گا۔

تقریب کے لیے وہ دوشالہ، جس کے بارے میں رقعہ بھی تحریر کیا گیا ہے، رکھ لیا ہے، لیکن پگڑی کی چوں کہ ضرورت نہیں تھی، اس کو واپس کر دیا گیا ہے۔ تسلیم کے علاوہ اور کچھ عرض کو نہیں۔ محمد اسد اللہ۔

(بروز سیر، ۱۲ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۸۲۹ء، لکھا گیا۔)

(۱۲)

اے میرے قدوم و مطاع، خدا آپ کی بزرگی کو دوام بخشے۔ محفلِ طرب کے انعقاد سے مجھے ابھی تک واقفیت نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ اس کے وقت اور محل سے مجھے مطلع کریں گے۔ کل قدوی نواب علی اکبر خان کا، کہ میرا دل جن کی عنایات کا شکار ہے، ہوگلی سے خط آیا ہے، بیمار ہیں اور مجھے عیادت کے لیے بلایا ہے۔ جی چاہتا ہے، چلا جاؤں اور ایک ہفتہ وہاں گزاروں۔ اسی وجہ سے تو میں پوچھ رہا ہوں کہ اگر آنے والے بدھ کے دن کو، جو آج سے پانچ دن بعد ہے، اس تقریب کا انعقاد ہے تو میں جانے میں توقف کروں اور بدھ کے بعد جاؤں اور اگر اتفاقاً یہ محفل رمضان میں ہونا قرار پائی ہے تو جلد چلا جاؤں تاکہ وقت پر واپس پہنچ جاؤں۔ امید کرتا ہوں کہ اس ضمن میں، جو امر خاطرِ اقدس میں محفوظ ہے، اس کے اظہار سے مجھے شاد کام و خاطر جمع کریں گے۔ زیادہ نیاز۔ اسد اللہ۔

(جمعہ ۲۳ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۷ فروری ۱۸۲۹ء، میں لکھا گیا۔)

(۱۳)

جناب الطاف پناہ، حضرت مرزا احمد بیگ خاں صاحب، خدا کی مہربانیاں آپ پر قائم رہیں۔ اے عالی جناب، خواجہ فیض الدین حیدر صاحب کے نام کا خط آپ کے پاس پہنچ رہا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اپنے رقعات کے ساتھ ہی اس کو بھی جہاں گیر نگر بھجوا دیں گے۔ عرض یہ ہے کہ اگرچہ ہمارے درمیان کوئی ایسا زیادہ رشتہ نہیں ہے پھر بھی کوئی عزیز اتنی دور سے اگر محبت نامہ بھیجے اور اسے جواب نہ ملے تو راقم کی بددماغی پر محمول ہوگا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ جناب عالی اس خط کی خاطر خصوصاً ایک خط لکھ کر روانہ فرمائیں۔ اس کا احسان مجھ پر ہوگا۔ زیادہ نیاز۔ اسد اللہ خاں۔

(بروزِ اتوار، ۲ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابق ۸ مارچ ۱۸۲۹ء، میں لکھا گیا۔)

(۱۴)

قبلۂ من۔ نوازش نامے نے مژدۂ لطف سے دل نوازی کی اور پگڑی کی رسید نے سرافرازی۔ تحریر تھا کہ آج محفل میں پہنچنا چاہیے، سو پہنچوں گا، لیکن اس شرط پر کہ جنابِ عالی قریب شام سیر سے آنے کا انتظار کریں۔ جب شام ہونے میں ایک گھنٹا باقی رہ جائے گا تو میں سر کے بل چل کر اس محلے میں پہنچ کر پہلے حکیم صاحب کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کروں گا اور اس کے بعد جناب کی خدمت میں پہنچ کر ملازموں کے معیت میں تقریب کے لیے پہنچ جاؤں گا۔

اور جو آپ نے محاورے کے بارے میں جاننا چاہا(۵) ہے تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ "قدم از سر ساختن"، "سر را قدم ساختن" اور "سر قدم ساختن" (سب کے) ایک ہی معنی ہیں۔ میں نے اہلِ زبان کو (یہ محاورہ) تینوں رنگ سے استعمال کرتے دیکھا ہے، لیکن اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ "قدم از سر ساختن"، یعنی "سر کے بل چلنا" اہلِ ہند کے مذاق کے مطابق اخذِ معنی کے سبب زیادہ خوش گوار ہوگا، فقط۔

اب اس فقرے کا جواب، جو جناب نے خط کے درمیان لکھا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ اس جزو واحد کے دو ٹکڑے نہیں کرنے چاہییں، اور اس عبارت کو دوسری بار نہیں کر سکتے۔ کوشش یہ ہو کہ جو چیز مطلوب ہے، عید سے پہلے مجھے یک مشت پہنچ جائے۔ باقی تفصیل بالمشافہ گوش گزار کر دی جائے گی۔ زیادہ نیاز۔ اسد اللہ۔

(بروز بدھ ۲۶ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۲۹ء، میں لکھا گیا)

(۱۵)

قبلۂ من، امید ہے کہ وہ سبز دوشالہ، جو میں گزشتہ رات آپ کے ملازموں سے لایا تھا، بخیریت تمام آپ تک پہنچے۔ دوسرے یہ کہ جناب فیض الدین حیدر صاحب کے نام، خدا تعالیٰ ان کو سلامت رکھے، ایک بندگی نامہ ارسال ہے۔ جناب عالی اپنے ملازموں میں سے کسی ایک کے ذریعے ذرا اس کو مکتوب الیہ تک پہنچوا دیں۔ مزید یہ کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم جب کبھی نزلے اور زکام میں مبتلا ہو گے تو برشعثا کی، جو "برش" کے نام سے معروف ہے، چاشنی میں تمہارا حصہ بھی ہو گا، سو نزلہ اور زکام بھی ہو گیا۔ اب کم از کم ایک تولہ اسی مرکب میں سے عنایت فرمائیے کہ دو تین روز اس کو استعمال کرنا شروع کر دوں۔ زیادہ نیاز۔

اسد اللہ

(بروز جمعہ ۶ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۷ اگست ۱۸۲۹ء میں لکھا گیا)

(۱۶)

اے میرے مخدوم، اتفاق یہ ہے کہ مجھے دو تین دن اور بھی کلکتے میں ٹھہرنا پڑے گا (چناں چہ) کل روانگی نہیں ہو گی۔ اگر کوئی امر مانع نہیں ہوتا تو جمعرات کے دن یقیناً کشتی میں سوار ہو جاؤں گا۔ میں نے جب دیکھا کہ ابھی فرصت ہے، میں آج جناب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ اور آشنا جگہوں پر جانا موقوف کر دیا۔ انشاء اللہ اتوار کے دن ایک دوسرے سے

رخصت ہوں گے۔ زیادہ نیاز۔

امید ہے کہ غلام حسین کے احوال کی اطلاع دیں گے۔ دوسرے، ڈھاکے کے خط کی روانگی سے بھی مطلع کریں گے۔ تیموری جلیل الرحمہ کا دیوان غالبؔ خواجہ مستقیم صاحب کو مل چکا ہوگا۔ والسلام والاکرام۔ فقط۔

(بروز ہفتہ، ۱۴ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۸۲۹ء، لکھا گیا۔)

(۱۷)

قبلۂ من، نوازش نامہ پہنچا اور منکشف حال (۵۱) ہوا۔ فدوی کو آج کے کھانے پر دو واضح عذر ہیں: ایک تو یہ کہ میں رات کو کھانا ہی نہیں کھاتا۔ دوسرے یہ کہ آج اتوار ہے اور اس دن میں گوشت سے پرہیز کرتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دسترخوان کے ایک طرف بیٹھا ایک بدھی کا ٹکڑا اور کباب لے کر کھاتا رہتا۔ (چناں چہ) امید کرتا ہوں کہ بہر صورت مجھے معاف فرمائیں گے مگر میرے لیے اپنا بچا ہوا محفوظ رکھیں، کل صبح کے وقت جناب کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کھا کر رخصت ہوں گا اور دریا پر پہنچ کر کشتی میں بیٹھوں گا اور روانہ ہو جاؤں گا۔ آج میرا حاضر ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ زیادہ بندگی۔ مولانا سراج الدین احمد صاحب سلام پہنچا رہے ہیں۔ فقط۔

(بروز اتوار، ۱۵ صفر (۵۲) ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۲۹ء، لکھا گیا۔)

(۱۸)

میرے مخدوم، میرے کرم کرنے والے، جناب مرزا صاحب والاصفات، خدا آپ کی عنایت زیادہ کرے۔ میرے دل میں ایک لطیف بات آئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے جاہ ور اور شیوا ور والاصفات کے دولت کدے پر قائم ہوں لیکن قلم نے شوق کی باگ پکڑ لی۔ (خیال یہ آیا کہ) ان دونوں جگہوں پر جیسی خلوت کر چکے

نہیں مل سکے گی، چناں چہ عرض یہ ہے کہ اس رقعے کو راؤ صاحب کی خدمت میں پہنچا کر اور میری درخواست سے ان کو مطلع کر کے سرِ شام یا ابتدائے شب، جب آپ چاہیں، راؤ صاحب کے ہم راہ میرے غریب خانے پر آنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس ضمن میں کسی قسم کی غفلت درمیان نہیں آنی چاہیے۔ مزید نیاز کے سوا اور کیا عرض کروں۔

گناہ گار اسد اللہ

(دورانِ قیام کلکتہ لکھا گیا۔)

(۱۹)

جنابِ عالی، خدا اپنے لطف کو آپ پر ہمیشہ قائم رکھے۔ عبودیت نامہ لے کر کہار آپ کی خدمت میں پہنچ رہا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ رحم علی کو ہدایت فرمادیں گے کہ دستار بند سے دستار کہار کو، اور مزدوری کی رقم کہار سے دستار بند کو دلوا دے۔ مزید یہ کہ سوائے نیاز اور کچھ نہیں۔

(دورانِ قیام کلکتہ لکھا گیا۔)

(۲۰)

میرے مخدوم، خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ہفتے ہو گئے ہیں کہ آنکھ آپ کے دیدار سے اور کان آپ کی آواز سے محروم ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ جناب مولانا سراج الدین احمد، خدا ان کے سائے کو دوام بخشے، دامنِ قلم کو اپنے چنگل میں تھامے، مجھے اپنے ساتھ برجو تالاب کے ہنگامے میں لے گئے تھے۔ خیال تھا کہ جنابِ عالی بھی سیر و تماشا کے لیے آئے ہوں گے۔ باوجود اس کے کہ میں نے اور مولانا نے اس آرزو میں لوگوں کی بھیڑ کے پردے کو چیر ڈالا، لیکن جناب کے ملازموں کی گردِ راہ بھی نہ مل سکی۔ مختصر یہ کہ اب قدرے اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا ہے کہ جناب کی خدمت میں حاضر کیوں نہ ہوا، اور اسی طرح قدرے

جناب کے تساہل اور تغافل سے ہزار گونہ پیچ و تاب میں ہوں کہ ان دس بارہ دنوں میں آپ نے میری خبر نہ لی کہ فلاں کو کیا درپیش ہے اور کہاں غائب ہو گیا؟ بہر طور، خدا آپ کو سلامت رکھے اور طویل عمر عطا کرے۔ فقط۔ حقیر اسد اللہ۔

(دورانِ قیامِ کلکتہ لکھا گیا۔)

(۲۱)

قبلۂ من، اس عنایتِ کلی کا شکریہ، کہ ایک عمر کے بعد مجھے یاد فرمایا ہے، بجز اس کے کہ ساری عمر (اس کی ادائیگی میں) گزار دی جائے، ادا نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ عمر اب کم ہی باقی رہ گئی ہے۔ بہر صورت، اس شکریے کی ادائیگی سے صرفِ نظر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی زبان کو تالو سے کھینچ باہر کر کے اور مغزِ دل و جان میں ڈال رہا ہوں تاکہ اس کی ادائیگی باقی نہ رہ جائے اور تالو اور زبان کی مدد کے بغیر ادائیگی انجام پائے۔ آپ بے کسوں کو یاد کرتے ہیں اور گناہ گاروں کو خط لکھ کر خوش کرتے ہیں، خدا آپ کو طویل زندگی دے۔ باہر سے اور اندر سے، یعنی دل سے بھی اور زبان سے بھی، فرزندانِ ارجمند کو دعا پہنچے۔ فقط۔

(بروزِ جمعہ، آٹھ شوال ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۸۲۹ء، کے بعد لکھا گیا۔)

(۲۲)

(شعر:)

[(خدا کرے) تیرا جسم طبیبوں کے ناز کا محتاج نہ ہو

(اور) تیرے نازک وجود کو کسی تکلیف سے پریشانی نہ ہو]

قبلہ و کعبہ، اس سے چند دن پیشتر صحیفۂ پاکیزہ حکیم صادق علی خاں کی وساطت سے مجھے ملا ہے۔ ابھی جواب نہ لکھا تھا کہ آج، چوتھی ستمبر اور نہ جانے ربیع الاول کی کون سی (۶) تاریخ ہو گی، نیک لوگوں کے کعبہ مولوی سراج الدین احمد کا خط (بھی) آ گیا۔ جس نے

جناب کی ناسازیِ طبیعت کی اطلاع دے کر مجھے رنجیدہ کر دیا۔ چوں کہ اس مکتوبِ دل پذیر میں بھی تحریر تھا کہ قبلۂ صورت و معنی حضرت حکیم احد علی کے علاج سے قدرے افاقہ ہوا ہے اور صحت کی امید بندھی ہے۔ خدا کی قسم، اس افاقے جتنی ہی میرے دکھ میں کمی واقع ہوئی ہے۔ خدا کے واسطے مجھ بے کس سے آنکھیں نہ پھیر لیجیے گا (بلکہ) جلد ہی اپنی صحت یابی کی خوش خبری دیجیے گا۔ اس کے بعد میں آپ کے خط کی آمد کی گھڑیاں شمار کرتا رہوں گا۔

اس خط میں، کہ حکیم صادق علی خاں نے مجھے پہنچایا ہے، علاقۂ ہوگلی کے قطع ہونے اور جہاں گیر نگر کے علاقے کی علاحدگی کا ارادہ اور کلکتے سے رنجیدگی کے ساتھ دارالخلافۂ دہلی کا عزمِ روانگی تحریر تھا۔ ہر چند جناب کے ملازموں کا دہلی آنا کائنات کی خوشیوں کی دولت ہے، لیکن کلکتے سے رنجیدگی بھی تو ایک قہر سے کم نہیں! بخدا، دہلی میں وہ توانائی نہیں کہ کوئی آزادہ منش یہاں خاک نشین بن جائے۔ اس آبادی کے لوگ بغیر سبب کے لوگوں کو تکلیف دینے والے ہیں اور اس ناہنجار سرزمین کے مردوزن مُردوں کے کھانے والے ہیں۔ نیت یہ ہے کہ جب یہ مقدمہ ختم ہو جائے تو کسی بہانے سے اس شہر سے نکل کھڑا ہوں اور کلکتہ پہنچ جاؤں۔ جان سے زیادہ عزیز! (آپ کو) درازیِ عمر و افزائشِ دولت کی دعا نصیب ہو۔ فقط۔

(بتاریخ ۳ ستمبر ۱۸۳۰ء، مطابق ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۶ھ لکھا گیا۔)

(۲۳)

قبلۂ من، جناب کا حکم میرے دل و جان پر رواں ہے۔ آپ جو کچھ فرمائیں، جی جان سے اس کی تعمیل کروں گا، لیکن آپ دہلی والوں کے اطوار سے واقف نہیں۔ میں نے جو حالات کو سمجھا ہے تو لوگ مجھ سے خائف ہیں، (سو وہ) آپ سے بھی بدگمان ہو جائیں گے، (اور خیال کریں گے کہ) مرزا احمد بیگ خاں نے اسد اللہ خاں کو اپنی جانب سے اس پر مامور کیا ہے کہ سارے معاملات میں ان کا عمل دخل ہو جائے۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو بدنام اور مجھے رسوا نہ کیجیے۔ عقل مند آدمی کو چاہیے کہ اگر کسی مقصد کی پیروی کر رہا ہو تو اس طرح اپنے آپ کو بے پروا اور لاتعلق ظاہر کرے کہ کسی کو اس کے راز کا پتا نہ چل سکے، نہ کہ آپ کی

طرح صاف دل اور بے فکر ہو جائے کہ باوجود بے حرصی اور بے غرضی کے لوگوں کی نظر میں انتہائی حریص اور لالچی قرار پائے۔ مقصد یہ ہے کہ ان عکما کے ٹولے پر صداقت کا گمان نہ کریں اور ان تمام کو اپنے آپ سے خائف اور اپنے قلعوں سے خوف زدہ تصور کریں۔ اگر اس شہر آنے کا ارادہ ہے بھی تو خاموش رہیے۔ جب آپ آجائیں گے، اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیں گے۔

مخدومی نواب مہدی علی خاں کے حال سے بے خبر ہوں۔ میں اس سراسیمگی کے سبب، کہ دائیں بائیں جس خوف و ہراس کے شکنجے میں انھوں نے مجھے ڈال دیا ہے، خط لکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ نواب صاحب کو بھلا عاجزوں کو یاد کرنے کا خیال کہاں؟ اسد اللہ۔ فقط۔

(ربیع الثانی ۱۲۴۶ھ مطابق ستمبر اکتوبر ۱۸۳۰ء، لکھا گیا۔)

(۲۴)

دکھے دلوں کو کوئی نالہ و فریاد سے منع نہیں کر سکتا اور نہ الم زدوں کو کوئی سینہ کوبی سے باز رکھ سکتا ہے۔ میرے لیے، کہ میرا دل تمہاری بے مروتی سے دکھا ہوا ہے، نالہ و فریاد کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تغافل کی اذیت سے جان دینے کے بعد اب اپنی محبت کا ماتم کر رہا ہوں۔ سینہ بھی کوٹوں گا، اگرچہ یہ شعر کی شان نہیں ہے۔ جب دو ہفتے گزر جاتے اور آپ کی اور مولوی سراج الدین احمد کی طرف سے کوئی خط نہ پہنچتا تو میں اپنا جگر اپنے دانتوں سے کاٹتا اور حواس باختہ ہو جاتا تھا۔ اب وہی آپ ہیں، وہی مولوی سراج الدین احمد اور وہی یہ غم زدہ دل زدہ۔ چھ ماہ ہو گئے کہ دو سطروں کے خط کے تقاضے پر بھی آپ نے کوئی سلام نہ لکھا۔ تو بھلا اس نامہ و پیام کے کیا معنی۔ (رہا) میرا خط نہ پہنچنے کا سوال، تو وہ اس کی صعوبت کہہ سکتا ہے کہ میں بھی آپ کی پیروی میں ترک محبت کی کوشش میں نہیں لگا۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ والله دل میں ایسا جلتا ہوں گا کہ مجھے سانس لینا اور بات کرنا دشوار ہوگا۔ اپنے منعم خدا کا شکر گزار ہوں کہ جسم کی اس لاغری کے باوجود اس نے ایسا مضبوط اور تنومند دل دیا

ہے۔ اگر، مثال کے طور پر، دونوں عالم تلپٹ ہو جائیں تب بھی مجھ پر اثر نہ ہوگا اور ان سب امور کے باوجود پاسِ وفا میں ایسا ثابت قدم ہوں کہ اگر سر بھی کٹ جائے، راہِ وفا سے میرے پاؤں نہیں لڑکھڑائیں گے۔ اب خدا کے واسطے یہ تو بتائیے کہ آپ کا دل کن خیالات کا مسکن رہا اور مولوی سراج الدین احمد کو کیا پیش آیا۔ شاید انھوں نے یہ سوچا کہ اسداللہ کی میل جول کی کوشش اس وجہ سے ہے کہ میں کونسل کے دفتر کا رکن بن گیا ہوں، یعنی جس دن سے کہ موصوف پیش گاہِ صدر عدالت میں مسند نشین ہوئے ہیں، کبھی ایسا نہ ہوا کہ مجھے یاد کیا ہو۔

(بروزِ جمعہ، ۲۵ صفر ۱۲۴۷ھ، مطابق ۵ اگست ۱۸۳۱ء، لکھا گیا۔)

بنام نواب علی اکبر خاں طباطبائی

(۲۵)

اے وفا آشیاں (ے)، غالب کی سرافرازی کا حکم نامہ پہنچا اور اس کی سیاہی چشم خرد کے لیے نظر فروز ہوئی۔ دو تین دن بعد دل میں جو خیال آئے گا، اعلان کے رنگ و بو کا آشنا ہو جائے گا (اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔)

آج میرے آقا جناب نواب محمد مہدی علی خاں بہادر میرے غریب خانے میں رونق افزا ہیں۔ خوشا میں اور میرے نصیب۔ خواجہ صاحبِ مشفق خواجہ مستقیم صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز پہنچائیں اور خدا کرے کہ وہ مقبولیت سے بہرہ ور ہو۔ از اسداللہ۔

(دورانِ قیام کلکتہ لکھا گیا۔)

بنام سراج الدین احمد (۸)

(۳۶)

اے میری جانِ امید! کل کی صحبت نے دل کو غبار آلود نہیں کیا اور نہ ہی دکھ کا کوئی کانٹا کریدتے میں ڈالا ہے کہ دل بات بنانے پر مائل ہو۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، ہرگز مکروفریب سے نہیں، اور اب بھی جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ منافقت یا پاسِ خاطر کے لیے نہیں کہہ رہا۔

بات کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی خواہش ہے کہ غالبِ آشفتہ بال شہلہ بازار کے ویرانے کا الو نہ بنے، بلکہ ہماری عظمت کے قلعے کی دیوار پر اپنا آشیانہ بنائے اور اس عنایت کے صرف دو اسباب ہو سکتے ہیں: ایک تو میری صحبت کے دوام کے لیے آپ کی انتہائے شوق، اور دوسرے غمِ مسافرت پر ایک قسم کا ترس۔ اگر پہلی والی بات ہے تب تو ٹھیک ہے، اور اگر دوسری، تو طالبِ انصاف ہوں۔ وہ اس طرح کہ جب اتنے بُعد اور فصل پر اس قدر موردِ عتاب ہوں تو ایسی قربت میں اپنی عزتِ نفس کی کس طرح حفاظت کر سکوں گا۔ بس، ایسے ہی دور دراز وسوسوں میں گرفتار ہوں۔

مجھے اپنے ایمان کی قسم کہ میں کمینوں کی سی طولانی باتوں میں کوئی شکایت نہیں کر رہا، لیکن فقہا (مستند ناقدینِ ادب) کی ناانصافی کے بارے میں بھلا کس طرح کہوں کہ شاکی نہیں۔ پہلے تو لوگ یہ کہنے لگے کہ فلاں قتیل کو بُرا کہتا ہے۔ دنیا مجھ پر چڑھ دوڑی اور ساری محفل میرے مقابل ہو گئی۔ ایک کو میرے منہ در منہ لاتے اور مجھے وادیِ شعر کا ایک بدحال شکار تصور کرنے لگے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کوئی بات نہ بنی اور ان کی بنی بنائی ساکھ بھی ہاتھ سے گئی تو جمع ہو گئے اور فیل اور رُخ کا پہلو بچا کر دشمنی کی شطرنج کی بساط کو صرف پیادوں کی چال کے لیے وقف کر دیا، اور میرے مہرے کو زچ کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں منصفینِ وقت سے جس چیز کا طالب ہوں، وہ سلیقہ سخن وری سے مشروط نہیں، سو اس جھگڑے کا کیا ڈر اور اس قضیے سے مجھے کیا نقصان:

(مصرع:)

[کتوں کے بھونکنے سے فقیر کا رزق کم نہیں ہوتا]

لیکن چوں کہ (یہ) چڑیوں کی پرواز عقاب کے پروں کے زور پر ہے، اور نہروں کی روانی دریا کے سہارے پر ہے، (اس لیے) میرا دل اس شہر (کلکتہ) سے کھٹا ہو گیا اور مجھے اس کا بہت دکھ ہوا۔ میں نے اپنی پیشانی خاکِ عجز پر رگڑی، پر انھوں نے (میری معذرت) قبول نہ کی۔ میں نے معافی اور اعتذار کا راستہ اپنایا، اس پر بھی کسی نے آفریں نہ کہا۔

اب میں خود حیران ہوں کہ اس مجلس کے عمائدین کے لیے کون سی خدمت بجا لاؤں کہ ان کی نظر میں مقبول ہوں۔ یہ سارا دل کا خون ہے کہ جو بے تکان میرے ہونٹوں اور حلق سے ٹپک رہا ہے اور اس میں کسی مقصد کا کوئی شائبہ نہیں ہے، (البتہ) جس چیز کا اظہار ضروری ہے وہ یہ کہ نجومیوں کا ایک عقیدہ ہے اور وہ کہتے ہیں کہ مبارک لوگوں کی عداوت کی نظر کوئی نقصان نہیں پہنچاتی، اور (اسی طرح) منحوس لوگوں کی محبت کی نظر کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔

خدائے بزرگ و برتر کی عظمت و جلال کی قسم کہ آپ کو میں نے انتہائی پاک طینت و نیک فطرت پایا ہے اور مرزا افضل اس احتمائی رشتے سے، جو وہ بظاہر (آپ کے ساتھ) رکھتے ہیں، صرف نظر فرمائیں (تو میں یہ کہوں گا کہ) آپ کی سخاوتِ ذات اور نیک فطرت پر اور مرزا صاحب کی رفاقت و قربتِ خاطر کو نظر میں رکھوں تو مجھے آپ کی دشمنی اس شہر کے عقلا کی محبت سے زیادہ عزیز ہے۔ حالاں کہ عداوت کا کیا موقع ہے اور دشمنی کا کیا محل، چوں کہ اس کا (بظاہر) کوئی سبب نہیں ہے اور عداوت غرض سے تعلق رکھتی ہے، جو ہر ہے نہیں۔ لیکن یہ بھی واضح کر دوں کہ اس ویرانے سے اٹھنا اور آپ کی الفت کی دیوار کے سائے میں بستر بچھا دینا بھی ایک رنجش کا امکان رکھتا ہے اور آشفتگی کا ایک خوف دامنِ فکر میں اٹھائے ہوئے ہے۔

آپ کی پریشانی کی تلافی تو میں کر سکتا ہوں اور آپ کی ناراضی بھی برداشت کی جا سکتی ہے، لیکن خوف اس بات کا ہے کہ اگر اس ٹوٹنے سے قربت ہو گئی تو کون سا دکھ ہے جو مجھے برداشت نہ کرنا ہوگا اور کون سی نادیدنی ہے جو مجھے نہ دیکھنا ہوگی۔ مگر بات یہ ہے کہ

دوست کی دی ہوئی تکلیف دشمن کی محبت سے بہتر ہوتی ہے۔ جب یہ اصول ثابت ہو گیا اور افقِ ذہن سے بیگانگی کا گرد و غبار بھی صاف ہو گیا تو میں نفسِ مقصد پر آتا ہوں اور امرِ زیرِ نظر کے رُخ سے نقاب اٹھاتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر ایک مکان میں رہنے سے قربت مستقل مقصود ہے تو وہ ممکن نظر نہیں آتی، (وہ اس طرح) کہ صبح سویرے آپ دفتر چلے جائیں گے اور پھر شام کو بے وقت واپس آئیں گے۔

رات آرام چین کے لیے ہے نہ کہ حرف و حکایت کے لیے اور اگر یہ ساری کوشش میری دل داری اور دل جوئی کے لیے ہے تو (کم از کم) ایک نظر ہی میرے حال (زار) پر ڈالیں، (اور دیکھیں) کہ میں کس حال میں ہوں اور کیا سوچ رہا ہوں۔ اس وقت تو میں خارِ سرِ راہ پر قطرے کی صورت اور انگارے کے اوپر رائی کے دانے کی طرح ہوں۔ اتنی مہلت نہیں (کہ یہ معلوم کر سکوں) کہ کاتبانِ تقدیر نے میری قسمت میں کیا لکھا ہے اور میری مٹی کو کیسی کیسی آرزوؤں کے خون میں گوندھا ہے۔ فلکشہ میرے سفرِ آوارگی کی انتہا نہیں ہے۔ مجھے (خود) نہیں معلوم کہ کون سے کوہ و بیاباں پار کرنے ہیں اور یہ پاؤں کن کن راہوں پر گھسانے ہیں۔ اگر دو تین ماہ آپ کی دیوار کے سائے میں ستا بھی لوں تو کیا فائدہ؟

(مصرع:)

[مجھے دیکھ کہ کس روزِ سیاہ سے دوچار ہوں!]

مختصر یہ کہ فی الوقت میرے لیے اس سے بڑی عنایت اور کوئی نہ ہوگی، اگر مجھے اس ویرانے کے ایک گوشے میں تنہا چھوڑ دیں اور مجھ بے کس کے بارے میں یہ فرض کر لیں کہ اس کو مسافرت میں موت آ گئی اور وہیں سپردِ خاک کر دیا گیا:

دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

اللہ بس، باقی ہوس۔ فقط۔

(صفر سے ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ تک، مطابق اگست تا اکتوبر ۱۸۲۸ء)

بنام خواجہ فیض الدین حیدر شائق جہاں گیر نگری(۹)

(۲۷)

(شعر:)

[اس ساری ملاطفت کے باوجود مجھے اس سے شکوے بھی ہیں
تاکہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں اس کی پرسش ہائے پنہاں ہی کا شکار ہو گیا۔]

اے مجسم محبت اور اے ہمہ تن عنایت، خدا آپ کو سلامت رکھے۔ لوگوں نے جو افقِ خاطر تک پہنچ کر یہ جان لیا کہ فلاں شخص کو تغافل کا شکوہ اور بے مہری کا رنج بے حد و حساب ہے تو وہ اس سبب سے کہ خط بھیجا ہے اور اپنے تلطف کی خوش خبری دی ہے، سو ہم نے بھی شکوہ شکایت بند کر کے مہربانی کی تعریف شروع کر دی ہے۔ (ہم جیسے) کوچہ الفت کے عاجزوں کی خوشی آپ کی نیم نگاہی کی نیت پر موقوف ہے۔ مکرمی جناب مولوی سراج الدین احمد صاحب نے بھی آپ کی طرف سے رخصت نہ کرنے کی معذرت کے باب میں مشفقی آغا محمد حسین صاحب کے ذریعے کچھ باتیں گوش گزار کی ہیں۔ خدا کی قسم، میں نے اپنے دل کو ہر قسم کی گزارش کے ضمن میں ہم نوا پایا ہے۔ چوں کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ غفلت دیدہ و دانستہ نہیں کی گئی اور اس وداع میں دردِ سر مانع تھا، بلکہ اس قضیے میں تو میں خود اپنے آپ سے مقابل ہوں کہ میں نے یہ مہلت ہی کیوں دی کہ رخصت کا وقت نہ مل سکا۔

کاش، جہاں گیر نگر میں کوئی میرا ایسا دوست ہوتا جو میری بے زبانی کی وکالت کرتا اور میری طرف سے معافی کا خواست گار ہوتا۔ کیا اچھا ہو اگر آپ میری بے کسی پر رحم فرمائیں اور خود ہی میری طرف سے اپنی معذرت طلب کر لیں۔ والسلام والاکرام، فقط۔

محمد اسد اللہ

[۲ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابقِ ۸ مارچ ۱۸۲۹ء]

(۲۸)

اے بندہ نواز، جواہر نامہ پہنچا اور جنابِ عالی کی خیریتِ احوال معلوم کر کے میں نے خدا تعالیٰ کی ثناخوانی کی اور اس کا شکر ادا کیا۔ بہر حال کی زاری اور بے چینی عام نظر آنے والی چیزوں میں انتہائی وسیع باتیں ہیں اور ان بدیہات میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ جس کسی کو بہر حل کی اضطرابی کا یقین نہ آئے وہ خود مٹھی بھر بہر حل لے اور آگ پر ڈال کر خود دیکھ لے کہ کس طرح تڑپتا ہے۔ ہاں، البتہ بہر حل کی بے چینی سیماب کی نفسی بے چینی کی طرح نہیں ہے اور (بہر حل کی) یہ بے چینی آگ کی گرمی کے اثر سے ہے۔ جب کبھی بات کرنے والا پہلے مصرع میں آگ کی طرف اشارہ کرے گا، جس طرح کہا گیا:

تا دیدم رُوے آتشینش

تو فوراً دوسرا مصرع صحیح، جائز اور روا ہو جائے گا:

مانندِ سپند بے قرارم

لیکن ان دو مصرعوں کو میں دہراتا ہوں:

مانندِ سپند بر قرارم

بہر حل انگارے پر ایک شکل اختیار کرتا ہے اس کو "بر قرار" سمجھنا فصیح نہیں۔ اور اگر اس کو "بر قرار" کہیں تو وہ خلافِ واقعہ ہو جائے گا۔ چوں کہ بہر حل حرارت کے اثر کے ہوتے ہی اڑ کر اپنے وجود کو ختم کر دیتا ہے۔ اب اس قدر صبر اس میں کہاں کہ قرار کی صفت اختیار کرے، لیکن:

مثلِ سیماب بے قرارم

بظاہر بے عیب مصرع ہے، لیکن اس کا پہلے مصرع سے کچھ تعلق نہیں بنتا چوں کہ سیماب بغیر آگ کے وجود کے ہی بے تاب ہوتا ہے اور یہ مصرع:

تا دیدم رُوے آتشینش

اپنے مقابل کوئی ایسی چیز مانگتا ہے کہ اس کو آگ کے قریب ہوتے ہی ایسی حالت سے دوچار

کردے جو اس قرب سے پیش تر اس میں نہیں تھی۔ بہر صورت، ان حالات میں تشبیہ، ماسوائے برق، پروانہ، باروت، خار و خس، یا اس قبیل کے الفاظ کے علاوہ کسی اور سے نہیں ہو سکتی، اور اگر یہ کہا جائے کہ سیماب بھی اگر آگ کے قریب ہو تو اس کی حالت بدل جاتی ہے، درست سہی، لیکن چوں کہ وجہِ تشبیہ بے قراری ہے اور سیماب کے اندر یہ استراری کیفیت ہے۔ بہر حال، اگر پہلا مصرع یہ ہے

دیدم تا رُوے آتشینش

تو مصرعِ ثانی "بے قرار" کی پابندی کی وجہ سے مصرعِ تر نہ ہو سکے گا:

مانندِ سپند بے قرارم

فقط۔

مطلعِ غزلِ جناب:

مسیحِ زمانست و جانِ منست ایں
جہانا کہ روح و روانِ منست ایں

بہت عمدہ اور بے عیب ہے، لیکن اگر "زمان" کی جگہ "جہاں" لائیں تو بہتر ہوگا، چوں کہ لفظ "جہاں"، "جاں" کے ساتھ زیادہ خوش گوار اور درست معلوم ہوتا ہے، بہ مقابلہ لفظِ "زماں" کے۔ پس، اس پر غور کریں۔

ہمیں خوں بہا بس بود بعدِ قتلم
چو گوئی کہ از کشتگانِ منست ایں

یہ شعر بہت اچھا اور بے جھول ہے لیکن "چو گوئی" سماعت پر بار گزرتا ہے اور دور از کار معنی دیتا ہے، (چناں چہ) آپ بے تکلفی سے:

بفرما کہ از کشتگانِ منست ایں

کیوں نہیں کہتے۔

نہ پرسید گاہے ز حالِ درونم
وفاے بتِ بدگمانِ منست ایں

اگر آپ عالمِ الفاظ سے ذرا سا آگے بڑھ کر کیفیت معنی پر بھی غور کر لیتے تو یہ شعر نغز گویانِ گزشتہ کے اشعار کا ہم پایہ ہو جاتا۔ اب میں اس بات کی وضاحت کرتا ہوں۔

اے میرے مہربان، کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ محبوب بے وفا ہے اور میرا حال نہیں پوچھتا، لہٰذا "بدگمان"، کہ "بت" کی صفت کے طور پر آتا ہے، حشوِ قبیح کی قبیل میں آ جائے گا۔ وجہ اس کی یہ کہ اس لفظ کو معنی میں کوئی دخل نہیں آپ یہ کیوں نہیں کہتے:

ادائے بتِ بدگمانِ منست ایں

اب اس کے معنی یہ ہوئے کہ میرا محبوب بدگمان ہے اور (میرے متعلق) جانتا ہے کہ عاشقِ صادق نہیں ہوں اور اپنے آپ کو محض مکر و ریا کے طور پر بیمار ظاہر کرتا ہوں، لہٰذا میرے دل کا حال نہیں پوچھتا اور اس کا حال نہ پوچھنا اس کی ایک ادائے بدگمانی ہے۔ خدا قسم، اس شعر میں (معنی کی) تہ داری اور استواری کا وہ جہان ہے، جس کو صرف کوئی صاحب ذوق ہی سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے چار شعر مع مقطع کے، اگر سچ کہوں تو (بیاض میں) رکھنے کے لائق نہیں ہیں اور کاغذ پر ظلم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بہتر کی تلاش کریں اور دوبارہ کہیں۔

(شعر:)

[اس کو نام و نشان سے جو کچھ بھی عطا کیا جائے

جب وہ پسند نہیں کرتا تو اس کو اس سے بہتر دیا جاتا ہے]

والسلام والاکرام، راقم اسد اللہ۔

گرامی نامے کے آنے کے دو گھنٹے بعد، جمعہ چھٹی صفر کو لکھا گیا، فقط۔

[جمعہ، ۶ صفر ۱۲۴۵ھ، مطابق ۷ اگست ۱۸۲۹ء]

بنام خواجہ محمد حسن (۱۰)

(۲۹)

جنابِ عالی، چوں کہ آج میں جناب کی فرمائش کی تعمیل میں ان چیزوں کی فراہمی میں لگا ہوں، اس لیے اگر خدمت میں نہ بھی پہنچوں تو حاضروں میں شمار ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ نواب سید عالم علی خاں صاحب کی تحریر کے لکات لکھ کر مجھے بھیجیں گے۔ بشرطِ زندگی کل دوپہر کے وقت جناب کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ زیادہ نیاز۔

اسداللہ

[عشرہ اولِ ماہِ رمضان ۱۲۴۸ھ مطابقِ ۲۲ تا ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء]

(۳۰)

قبلۂ حاجات! چوں کہ آپ کا گزر گڑگاؤں کے راستے سے نہیں ہوا اور مجھے علم ہوا کہ آپ کو میرے دیوان کے حصول کا شوق بے انتہا ہے، مجبوراً میں نے نواب صاحبِ قبلہ و کعبہ مبارزالدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کی خدمت میں عرض داشت پیش کی اور وہ دیوان، کہ جناب موصوف نے انتہائی شوق سے (اپنے لیے) لکھوایا تھا، (عاریتاً) طلب کیا۔ خدا تعالیٰ نواب صاحب کو زندہ و سلامت رکھے کہ انھوں نے اپنے شوق کی نفی کر کے دیوان کے تحریر شدہ اجزا مجھے دے دیے، چناں چہ وہ اجزا آپ کی خدمت میں بھیجے جا رہے ہیں۔ ان کو احتیاط سے رکھیے گا اور حیدر آباد پہنچ کر ان کو ترتیب سے مجلد کرا لیجیے گا۔ زیادہ نیاز۔

اسداللہ

[عشرہ اولِ ماہِ رمضان ۱۲۴۸ھ مطابقِ ۲۲ تا ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء]

(۳۱)

صاحبِ حمیدہ صفات، والاشان، فدوی کے مخدوم و مستاع، جناب خواجہ محمد حسن، خدا آپ کے درجات میں اضافہ کرے۔ قبلۂ من! ہر چند کہ آپ کی زبانِ گوہر فشاں نے مدعا میرے گوش گزار کر دیا ہے، لیکن پھر بھی وہ اس لائق نہیں کہ اس خط میں اس کو موضوع بنایا جائے اور بات کو اس کی وضاحت میں طول دیا جائے۔

عبارت میں رنگ بھرنا، جا و بے جا استعارات کا عبارت میں استعمال، دراصل مقصد سے دور ہونا اور مکتوب الیہ کو الجھن میں ڈالنا ہے، لیکن اگر حکم کی تعمیل نہ کروں تو آپ رنجیدہ خاطر ہوں گے۔ بہر صورت، چند سطریں، کہ سیدھی سادھی ہیں، رقم کر رہا ہوں اور وہ یہ ہیں:

> اس سے پہلے دو فدوی نامے لکھتو سے، ایک تو وہاں پہنچتے ہی اور دوسرا اس شہر سے روانگی کے وقت جناب کی خدمت میں ارسال کر چکا ہوں، غالباً آپ کی نظرِ بندہ پروری سے گزر کر کاشفِ احوال ہوئے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ فدوی، جنابِ عالی کے اقبال کی رہ نمائی میں مستقبل کی ازدیادِ درجات کی پیشوائی کے لیے دارالخلافہ شاہ جہاں آباد پہنچ کر سفر کی تکان سے آرام کر کے یہ قصد کر رہا ہے کہ سفر کی تیاری کر کے منزلِ مقصود کے لیے چل پڑے اور نیکی کی علامتی اور اس کی خیر خواہی کے لیے جو کچھ میرے خاطرِ عجز پرورده میں محفوظ ہے، منصّۂ شہود پر لے آئے۔ باقی ضروری باتیں برادر صاحبِ قبلہ خواجہ فخر اللہ صاحب کی زبانی آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔ زیادہ حدِ ادب، بزرگی و اقبال مندی کا سورج جاہ و جلال کے مشرق سے دائمی ترقی کے ساتھ ہمیشہ تابندہ و درخشاں رہے۔ بس، بات ختم ہوئی۔

اسد اللہ دوبارہ عرض کرتا ہے کہ مطلب مختصر ہے اور مختصر بات کو بے جا طول دینا، عبارت کے نقائص میں سے ہے البتہ القاب کے اضافے میں آپ کو اختیار ہے۔ اگر ایک دو لفظ بڑھا دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ والسلام والاکرام۔

[عشرۂ اولِ ماہِ رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۲۲ تا ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء]

بنام خواجہ فخر اللہ (۱۱)

(۳۲)

اے اسد اللہ الغالب، خدمت عالی بلند مرتبہ خواجہ صاحب اعلاصفات، عظیم الشان، نیازمندوں کے مطاع و مخدوم، خواجہ فخر اللہ صاحب کی (خدا ان کی بزرگی بڑھائے اور ان کی محبت کو بلند کرے) خدمت میں منظور و قبول ہو۔

قبلۂ حاجات! خط کی ابتدا ہی میں دوست کی اعلا منشی کی تعریف خوشامد اور داستان سرائی ہے، سو یہ آہنگ ریاکاروں کو مبارک ہو اور تحریر کے پہلو بہ پہلو داستانِ شوق بیان کرنا محبوب کے راز کے چہرے پر نقاب ڈال دینے سے مماثل ہے، سو یہ طریقِ کار پردہ شناسوں کے حوالے۔

مقتب طریقہ نامہ نگاری کا وہ ہے کہ تحریر و تقریر میں اس قدر فصل نہ آجائے کہ اس دھاگے کے تار کو دوسرے کے تار سے بٹا نہ جا سکے اور ایک کا خدوخال دوسرے کے آئینے میں نظر نہ آئے۔ غرض یہ کہ صرف اس جرم میں کہ میں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ آنکھ بھی محبوبِ مدعا کے جلوے کی عکاسی کرے، کیا کیا دن ہیں کہ میرے لیے اندھیر نہ ہوئے اور صرف اس خطا کی پاداش میں، کہ اپنے ہاتھ سے لیلائے مراد کی زلفوں کو سنواروں، کون سی مصیبت ہے جو اس دنیا میں میں نے نہ برداشت کی۔ دشمنوں کے مرتبے سے زاری کرتے ہوئے اور تلوار کی دھار پر اپنا سونز رگڑتے ہوئے میرا کلکتے پہنچنا اور اس کھلی شاد و آباد بستی میں امید و خوف کی کش مکش میں بے چین گزارنا، اور وہاں سے دعائے نامقبول کی طرح واپس آنا اور بن بلائی بلا اور آفت ناگاہ کی طرح نکل جانا اور تدبیر کے شیشے کا پتھر پر چُور چُور ہو جانا اور وینا کی کرچیوں کا (میرے) پاؤں میں چبھ جانا اور مسٹر انڈرو اسٹرلنگ کا مقدمے کی ابتدا ہی میں یکایک وفات پا جانا اور اس قضیے کے آخر میں مولوی محمد محسن کا درمیان سے نکل جانا اور ناکارہ بیماری کا جوہر درستی و احوال پر اثر انداز ہونا اور طوفانی سوچوں میں (میری) کوششوں اور تدبیروں کا

پانی ہو جانا، غرض اس قسم کے حوادث کو میں پورا بیان کروں اور سر تا سر پیش کروں تو سو صفحوں میں بھی نہ سمائیں اور ہزار خطوط میں بھی اختتام پذیر نہ ہوں۔

قدوی خواجہ محمد حسن صاحب نے اس نامہ نگار کی وہ مصیبت دیکھی ہے اور وطن میں میری غربت کا نظارہ کیا ہے۔ میرا دل فرنگی بے وفاؤں کے اختلاط سے اوبھ گیا ہے اور میری روح ان سیاہ قلب حبشیوں کے میل جول سے تنگ آ گئی ہے۔ اب نیت ہے کہ اگر کوئی ہندوستان کا صاحبِ مرتبہ شخص میری طرف توجہ کرے اور بہ شیوۂ پاس داری و اصولِ مرتبہ دانی، مجھے اپنے پاس بلالے تو میں دل کو اس کے راستے کی دل آویزگی کی زلفوں کے پیچ و خم میں باندھ دوں اور پھر اپنا رختِ سفر اس کے بلند قلعے کی دیوار کے سائے ہی میں کھولوں، ورنہ قلندروں کے طور سے اس سیاہ خاک دان سے اٹھ کر جگہ جگہ، قریہ قریہ گھومتا ساری دنیا کا گز بن جاؤں۔ دل، یزد کے آتش کدوں کا طواف چاہتا ہے اور آنکھ شیراز کے شراب خانوں کے دیدار کی تمنائی ہے۔ میرا شوق اس ضمن میں، اس رنگ کے صدہا نغمے رکھتا ہے۔

(شعر:)

[غالب، ہندوستان سے بھاگ چل، بغیر محنت کے تجھے مہلت ملی ہے
اصفہان میں زندگی گزارنا اور نجف میں مرنا مجھے پسند ہے]

چند سطریں صنعتِ تعطیل میں میرے قلم سے مترشح ہوئی ہیں اور دل اس آرزو کے جلوے کی ہوس کا شہید ہو گیا ہے کہ اس ورق کا عنوان بلند القاب سردارِ جہاں و مرکزِ دنیائے مشرق کی نظر کی روشنی سے گزرے۔ اگر طولِ وقت کی کشش کی چھری نے حرفِ وفا کو دل کے صفحے سے چھیل نہیں ڈالا ہے اور اگر بے پروائی کی آندھی نے غالبِ سرگشتہ کی خاک ساریوں کو یاد سے اڑا نہیں دیا ہے تو دعا سے دریغ نہ فرمائیں۔ والسلام والاکرام، اسد اللہ۔

[۱۰ رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء]

توضیحات و حواشی

(۱) قاضی عبدالودود کے نزدیک غالب کے ابتدائی پچیس خط مرزا احمد بیگ تپاں کے نام ہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کا خیال ہے کہ پچیسواں خط، دراصل نواب سیّد اکبر علی طباطبائی کے نام ہے ("آثارِ غالب"، طبعِ دوم، ص ۹۵)
مرزا احمد بیگ تپاں کے حالات میں دیکھیے: حاشیۂ قاضی عبدالودود ("آثارِ غالب"، ایضاً ص ۴۹-۵۰) تپاں کے نام خطوں میں متعدد اشخاص کا ذکر آیا ہے۔ ان اصحاب کے حالات میں، نیز تپاں کے نام خطوں کے بعض تصریح طلب امور کے ضمن میں، قاضی عبدالودود کے حواشی رہ نما تحریر کا درجہ رکھتے ہیں (دیکھیے، "آثارِ غالب"، ایضاً ص ۵۱ تا ۶۲)
غالب کے ان خطوط، اور ان خطوں میں مذکور افراد اور مباحث کے ذیل میں ڈاکٹر حنیف نقوی کے "حواشی" بھی بہت قیمتی اضافہ ہیں۔ ("آثارِ غالب"، ایضاً ص ۶۹ تا ص ۹۴)

(۲، ۳) قاضی عبدالودود صاحب نے خط نمبر: ۳ کے حاشیے میں لکھا ہے کہ "شبِ شادیِ نورِ چشم" ہندستانی فارسی ہے۔ اسی خط میں غالب نے "بے خبر برخاستم" لکھا ہے اور اس سے یہ معنی لیے ہیں کہ کسی کو بغیر خبر کیے اٹھ گیا۔ حالاں کہ بظاہر ان الفاظ سے یہ معنی ہر گز نہیں نکلتے۔
قاضی صاحب کے دونوں اعتراضات بالکل صحیح ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ غالب اپنے ایرانی فارسی کے دعووں کے باوجود ہندستانی تھے اور اردو

محاورے کو فارسی میں ترجمہ کرتے تھے۔ مثلاً "نزدِ من آدم کجا کہ کار سر انجام دہد"، یا "سہ روز است کہ ہر روز آدمِ من می رسد" وغیرہ۔ یہ سارے جملے ٹھیٹھ ہندوستانی اردو محاورے کا فارسی ترجمہ ہیں اور ہر گز ہر گز ایرانی فارسی نہیں۔ صرف ماثرِ غالب کے ۳۲ خطوط میں قدم قدم پر ایسے جملے ہیں جن میں محاورہ خالصتاً اردو زبان کا ہے، بلکہ ایک آدھ جگہ تو غالب نے متداول فارسی کے خلاف فارسی لکھی ہے۔ مثلاً خط:۲۵ میں لکھتے ہیں:

> بعد دو سہ روز آنچہ بہ خاطر خواہد گزشت، مرمِ رنگ و بوے اعلان خواہد گشت۔

اس جملے میں پہلا "خواہد" زائد اور خلافِ دستورِ فارسی ہے اور یہ بھی اردو طرزِ اظہار ہی کا شاخسانہ ہے۔

(۴) خط:۴ کے حاشیے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ یہاں "معترض" کی جگہ "معترض الیہ" ہونا چاہیے۔ حالاں کہ جملے میں دوسرا "معترض" بالفتح "را" ہے اور عربی قاعدے کے مطابق اسمِ مفعول ہے، جس کے معنی ہوئے: جس پر اعتراض کیا جائے۔ اس لیے قاضی صاحب کی فکر کے مطابق "جس پر اعتراض کیا گیا ہو" اس کا ترجمہ کیا جائے تو وہ بھی "معترض علیہ" ہو سکتا ہے، "معترض الیہ" ہر گز نہیں۔

(۵) خط:۱۴ کے حاشیے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> "استشعار" کے معنی "استفسار" نہیں۔ یہ کاتب، یا غالب، کی غلطی ہے۔

سو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ یہ عربی میں "بابِ استفعال" سے ہے اور اس کے معنی "شعور چاہنا" ہیں۔ اس معنی کو ذہن میں رکھیں تو یہ لفظ جملے میں بالکل درست استعمال ہوا ہے۔ چناں چہ یہ نہ کاتب کی غلطی ہے اور نہ غالب کی۔

(۶) خط:۲۲ کے حاشیے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

"چندم" اب تک کہیں میری نظر سے نہیں گزرا۔

یہ عجیب اعتراض ہے۔ یہ مستند فارسی کا روزمرہ کا لفظ ہے اور اردو کے الفاظ "کون سا"، یا "کون سی" کے مترادف ہے، مثلاً اگر فارسی میں کہیں: "تم کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟" تو کہیں گے: "شما در کلاسِ چندم درس می خوانید؟" اس لحاظ سے غالب نے "چندم ربیع الاول" بالکل درست لکھا ہے۔

(۷) قاضی عبدالودود غالب کے اس خط [نمبر: ۲۵] کو مرزا احمد بیگ تپاں کے نام شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں کہ:

> اس خط کا اندازِ تخاطب تپاں کے نام کے عام خطوط کے انداز سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے ہمیں شبہ (ہے) کہ یہ ان کے نام نہیں... بعض شواہد کی بنا پر ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی کے نام ہے۔ نواب صاحب کا قیام ہوگلی میں تھا اور خواجہ محمد مستقیم صاحب بھی، جن کی خدمت میں سلام نیاز پہنچانے کی اس خط کے مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی ہے، ہوگلی ہی میں رہتے تھے۔ علاوہ بریں "سپہر آستانا" جیسے القاب بھی تپاں کی نسبت نواب صاحب موصوف (سید علی اکبر خاں طباطبائی) سے تخاطب کے امکان کو تقویت بخشتے ہیں۔

("مآثرِ غالب"، ایضاً، ص ۹۵)

(۸) مولوی سراج الدین احمد کے حالات کے لیے رجوع کیجیے:

(الف) "مآثرِ غالب"، ایضاً، ص ۵۷ و بعد۔

(ب) "بزمِ غالب"، عبدالروف عروج، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۹۳-۱۹۱

(ج) "مآثرِ غالب"، ایضاً، حواشی و استدراک از ڈاکٹر حنیف نقوی، ص ۹۸/۹۷

(۹) خواجہ فیض الدین حیدر شائق جہاں گیر نگری کے احوال میں دیکھیے: "تاثرِ غالب"، ایضاً، ص ۵۱۔

(۱۰) خواجہ محمد حسن کے احوال میں دیکھیے: "تاثرِ غالب"، ایضاً، ص ۵۲، نیز حاشیہ و استدراک از ڈاکٹر حنیف نقوی، ص ۸۴۔

(۱۱) خواجہ فخراللہ، خواجہ محمد حسن کے بھائی تھے ("تاثرِ غالب"، ایضاً، ص ۵۲)۔ خواجہ محمد حسن اور خواجہ فخراللہ، غالباً خواجگانِ ڈھاکا سے تعلق رکھتے تھے۔ بظاہر یہ دونوں ریاست حیدر آباد سے وابستہ تھے (ڈاکٹر حنیف نقوی، "تاثرِ غالب"، ایضاً، ص ۸۴)۔

مختصر فرہنگِ ماثرِ غالب

۱-	مستطاب	اچھا، عمدہ، پاک، لذیذ۔
۲-	حالی گردید	معلوم ہوا۔
۳-	رافت انتساب	مہربانی سے نسبت رکھنے والا۔
۴-	مطاعی	مطاع، اطاعت شدہ۔ (”ی“ ضمیرِ عربی، بمعنی میرا)
۵-	تفقد	ڈھونڈھنا، پوچھنا، غم خواری کرنا۔ (جمع=تفقدات)
۶-	تصدیع	دردِ سر، تکلیف دہی۔
۷-	سوارہ	سوار ہو کر۔
۸-	متصدی	پیش خدمت، پیش کار
۹-	مختصر مفید	مختصر اور مفید مطلب۔
۱۰-	مقرون	نزدیک کیا ہوا، ملایا ہوا۔
۱۱-	توفیر	زیادتی، ٹھیکے کا نفع۔
۱۲-	استشعار	شعور چاہنا۔
۱۳-	مبادرت	پہل، شروعات، to expedite۔
۱۴-	اولوش	(=الوش، الش) اسیروں کا بچا ہوا کھانا۔

۱۵-	اخاذ	اخذ کرنے والا۔
۱۶-	طماع	لالچی۔
۱۷-	مُرم رنگ و بوے اعلان خواہد گشت۔	اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔
۱۸-	خدعہ	مکروفریب۔
۱۹-	صداع	دردسر۔
۲۰-	صدد	نزدیکی، مقابلہ، ارادہ، قصد۔
۲۱-	بادخواں	خوشامدی۔
۲۲-	بادافراہ	گناہ کی سزا۔
۲۳-	اعراض ردیہ	ناکارہ بیماری۔
۲۴-	کزلک	چھری۔
۲۵-	سہام	سرگشتہ، حیران۔

یہ کتاب غالبیات ہی میں نہیں، قاضی عبدالودود کے تحقیقی کاموں میں بھی گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں غالب کی اردو فارسی نظم و نثر کی متعدد نادر و نایاب تحریروں کو یکجا کر کے ان پر عالمانہ حواشی لکھے گئے ہیں۔

یہ کتاب عرصے سے نایاب تھی، ممتاز محقق ڈاکٹر حنیف نقوی نے اسے از سرِ نو مرتب کیا ہے اور نہایت دیدہ ریزی سے قاضی عبدالودود کے تحریر کردہ حواشی پر اضافے کیے ہیں۔ زیرِ نظر ایڈیشن کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ ترجمہ خوش فکر شاعر اور فارسی زبان و ادب کے مزاج داں پرتو روہیلہ نے کیا ہے۔

ادارۂ یادگارِ غالب

کراچی

